اردو

انٹرمیڈیٹ کورس

حصہ نظم

(راجہ) رام کمار پریس

وارث

نول کشور پریس لکھنؤ

۱۹۵۲ء

قیمت عہ/ ۱۲

August 20, 1950

Acd.
7/8/80

मोहम्मद यूसफ
खजवाल

[illegible]

اردو انٹرمیڈیٹ کورس

حصۂ نظم

مؤلفان

(۱) عبدالشکور ام، اے۔ بی، ٹی

و

(۲) خواجہ احمد فاروقی ام، اے۔ ال، ٹی

ناشر

راجہ رام کمار پریس لکھنؤ

وارث نول کشور پریس لکھنؤ

۱۹۵۲ء

فہرست

مقدمہ

یہ مجموعہ مندرجہ ذیل اصناف سخن پر مشتمل ہے :۔

(۱) غزلیات

(۲) قصائد

(۳) مراثی

(۴) مثنویات

(۵) منظومات جدید

انتخاب کرتے وقت ہم نے حسب ذیل اصولوں کو پیش نظر رکھا ہے :۔

(۱) ہر صنف میں ابتدا سے عصر حاضر تک مشاہیر شعرا کا کلام پیش کیا گیا ہے تاکہ طلباء پر اس صنف کی تدریجی ترقی اور عہد بہ عہد کی تبدیلیاں واضح ہوجائیں۔

(۲) شعرا کے حالات اور ان کے کلام پر مختصر تنقید بھی درج کی گئی ہے لیکن ہر جگہ اس کی گنجائش چھوڑی ہے کہ طلبا، اپنی صحیح رائے قائم کرسکیں۔

(۳) انتخاب اس طرح کیا گیا ہے کہ ہر دور کی خصوصیات سامنے آجائیں اور طلباء زبان و بیان، لب و لہجہ اور انداز فکر کی تبدیلیوں سے بھی روشناس ہوجائیں۔

(۴) عصر جدید کے میلانات و رجحانات سے خاص طور پر بحث کی گئی ہے

تاکہ طلبا حال کو سمجھ کر مستقبل کا اندازہ کریں۔ نیز اس کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ وہ ماضی کا صحیح جائزہ لے سکیں۔

(۵) اُردو شاعری میں رنگا رنگی ہے۔ یہ تنوع دراصل ہماری زندگی سے آیا ہے، کوشش کی گئی ہے کہ یہ مجموعہ بھی اس تنوع کا پوری طرح آئینہ دار ہو۔

(۶) طلبا میں ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنے اور ان میں اپنی کورس کی کتاب کے علاوہ بھی شعر و ادب کے پڑھنے کا شوق بیدار کرنے کے لیے، مزید مطالعہ کے لیے ہدایات دی گئی ہیں۔

(۷) گلچین بہار کو ہمیشہ تنگی داماں کا گلہ رہا ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ بعض شعرا کو ان اوراق میں اتنی جگہ نہ مل سکی ہو جتنی دل میں ہے لیکن ہم نے اس مقصد کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا کہ پورے دور کی ایک نمائندہ تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جائے اور مختلف اصناف سخن کی عہد بہ عہد تبدیلی اور تدریجی ترقی بھی واضح ہو جائے۔

خدا کرے یہ مساعی مشکور ہوں اور یہ مجموعہ طلبا کے ادبی ذوق کو لطیف بنانے اور ان کے معیار کو بلند کرنے میں کامیاب ثابت ہو۔

عبد الشکور
و
خواجہ احمد فاروقی

غزل

غزل کے معنی ہیں عورتوں سے عشق و محبت کی باتیں کرنا ممکن ہے کہ اس کے مطابق کبھی عمل بھی ہوا ہو اور غزلیں اسی کے لیے مخصوص ہوں۔ مگر فارسی کے اتباع میں اُردو کے شعرا نے غزل کو سب اصناف سخن سے اہم اور ضروری صنف سمجھا، اور اس میں تصوف، [illegible]، فلسفہ، علم النفس وغیرہ کے مسائل ہی نہیں بلکہ جذبات گوناگوں کی بھی ترجمانی ہوتی رہی اور اسی لیے یہ واردات قلبیہ اور تمام امور ذہنیہ کے اظہار کا آلۂ کار سمجھی گئی۔

غزل کے اول میں ایک مطلع یا دو مطلع یا تین مطلع یا اس سے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ مطلع سے مراد یہ ہے کہ پہلا شعر دونوں مصرعوں میں قافیہ اور ردیف رکھتا ہو۔ اور اگر اُس میں ردیف نہ بھی ہو تو قافیے ضرور ہوں۔ غرض کہ غزل اُن اشعار متفق الوزن والقوافی کا نام ہے جس کی بیت اوّل کے دونوں مصرعے مقفّٰی ہوں اور پہلی بیت کو مطلع دوسری بیت کو حسن مطلع و زیب مطلع کہتے ہیں۔

غزل کے تمام اشعار کے دوسرے مصرعوں میں قافیہ و ردیف ہوتا ہے اور اب اکثر تمام اشعار متفرق خیالات اور مختلف مضامین کے ہوتے ہیں۔ تسلسل مضمون غزل کے لیے ضروری نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے غزل کے مضامین مسلسل ہوتے تھے۔ اب غزل کے اشعار

طاق ہوتے ہیں۔ اور غزل کے اشعار کی تعداد کم سے کم تین شعر اور زیادہ سے زیادہ پچیس ہونی چاہیے۔ بعض نے کہا ہے کہ کم سے کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ گیارہ شعر غزل کے لیے کافی ہیں۔ مگر شعرا نے اس کی کوئی خاص پابندی نہیں کی۔ اور شعرائے متاخرین کے یہاں پچاس پچپن شعر تک کی تعداد ایک غزل میں دیکھی گئی ہے۔

"دورِ حاضر کی غزل، ماضی سے لب و لہجہ، انداز بیان اور وسعتِ مضمون کے اعتبار سے بدلی ہوئی ہے۔ لیکن اس جدت پسندی اور نئی جہت کی تعمیری کوشش میں درد و تاثر اور شعریت بھی گھٹ گئی ہے۔ انقلاب اور لفظ تراشی کے جوش میں اصول شعر و غزل سے بے اعتنائی برتی گئی ہے"، لیکن یہ گزرنے والی موج ہے۔ ممکن ہے اس طرح غزل کی زمین اور زرخیز ہو جائے۔ اب غزل کا دامن وسیع ہے اور اس میں حیات و کائنات اور قومیات شعری کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔

ولی اورنگ آبادی

ولی محمد نام ہے اور اورنگ آباد وطن ہے، ان کے خاندان اور تعلیم و تربیت کا صحیح علم نہیں، تاریخ ولادت بھی تحقیق کے ساتھ نہیں معلوم ہو سکی۔ اب تک صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ انھیں علوم متداولہ کا بہت شوق تھا اور اسی کی تحصیل کے لیے اُنھوں نے گجرات اور دہلی کے سفر اختیار کیے۔

ولی نے احمد آباد میں حضرت شاہ وجیہ الدین کی خانقاہ میں

تعلیم پائی اور شاہ نورالدین سہروردی کے مرید ہوئے۔ دہلی کے سفر میں انھوں نے حضرت شاہ سعداللہ گلشن سے بھی ملاقات کی، انھوں نے ولی کو یہ مشورہ دیا کہ وہ ہندی کو چھوڑ کر فارسی شعراء کے کلام سے استفادہ کریں۔

ولی اورنگ آبادی دوبارہ دلی نہیں گئے جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ جدید تحقیق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ۱۱۱۹ھ میں بمقام احمدآباد انتقال فرمایا اور وہیں شاہی باغ میں مدفون ہوئے۔

ولی کے کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کو آیاتِ قرآنی، احادیث اور تصوف کی اصطلاحات پر کافی عبور تھا اس سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے زمانے کے دینی اور دنیوی علوم سے پوری آگاہی حاصل کی تھی۔

ولی نے تمام اصناف سخن میں اپنی شاعری کا کمال دکھلایا ہے ان کی کلّیات کے دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں زبان کی تعمیر کی قابلیت پورے طور پر موجود تھی۔ اساتذۂ فارسی کا کلام ان کے پیش نظر تھا، اس طرح طرزِ ادا کے تمام اسلوب انھیں مستعار مل گئے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی شاعری میں ایک درد اور کسک ہے جو دوسری جگہ نہیں ملتی اس کی وجہ یہ ہے کہ جو دوسروں کے یہاں قال تھا ان کے یہاں حال تھا، وہ خود صوفی صافی اور صاحب دل تھے۔ وہ صاحب کیف ہیں اس لیے ان کی غزلوں میں تاثیر اور تپش ملتی ہے۔ ان کی غزلیں جو سہل ممتنع ہیں وہ بڑی لطف انگیز اور بامزہ ہیں۔

ولی سے پہلے دکن میں غزل گوئی کا کافی رواج تھا لیکن اس میں وہ لطافت نہیں تھی جو ولی کی خصوصیت ہے۔ زمانے کے اثر سے ولی نے قدیم اردو میں بھی شعر کہے ہیں لیکن کلیّات میں ٹھیٹ دکنی زبان کا استعمال زیادہ نہیں ہے۔

غزلیات

ولیؔ

یاد کرنا ہر گھڑی اس یار کا
ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا

آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں
تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا

عاقبت کیا ہووے گا معلوم نہیں
دل ہوا ہے مبتلا دلدار کا

کیا کہے تعریف دل ہے بے نظیر
حرف حرف اس مخزنِ اسرار کا

گر ہوا ہے طالبِ آزادگی
بند مت ہو سبحہ و زنّار کا

مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی
دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

اے ولی ہونا سریجن پر نثار
مدعا ہے چشمِ گوہر بار کا

سجن تم مکھ ستی کھولو نقاب آہستہ آہستہ
کہ جیوں گل سوں نکلتا ہے گلاب آہستہ آہستہ

آیا نکہت کی گرمی سوں پسینہ جب زنخداں پر
کہ جیوں خم سوں نکستی ہے شراب آہستہ آہستہ

ہزاروں لاکھ خوباں میں سجن میرا چلے یوں کر
ستاروں میں چلے جیوں ماہتاب آہستہ آہستہ

سلونے سانورے پیتم ترے موتی کی جھلکاں نے
کیا عقد ثریا کوں خراب آہستہ آہستہ

جسے عشق کا تیر کاری لگے　اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے
نہ چھوڑے محبت دم مرگ لگ　جسے یار جانی سوں یاری لگے
نہ ہووے اسے جگ میں ہرگز قرار　جسے عشق کی بے قراری لگے
ہر اک وقت مجھ عاشق زار کوں　پیارے تری بات پیاری لگے

ولیؔ کوں کہے تو اگر ایک بچن
رقیباں کے دل میں کٹاری لگے

سوالات

۱۔ غزل کی مختصر تاریخ لکھیے۔

۲۔ کیا ولیؔ کو اردو غزل کا "ابو الآبا" کہا جا سکتا ہے؟

۳۔ ولیؔ کی غزلوں میں جو مانوس الفاظ ہیں اُنکی فہرست مرتب کیجئے۔

۴۔ ولیؔ دراصل گجرات کے رہنے والے تھے لیکن انکو دکھنی کہا جاتا ہے اس سلسلہ میں جو مضامین "رسالہ مصنف" میں شایع ہوئے ہیں انکا مطالعہ کیجئے۔

میر تقی میر

آپ کا اسم گرامی محمد تقی، تخلص میر۔ والد ماجد کا نام میر عبداللہ یا محمد علی عرف علی متقی تھا۔ آپ کا مولد اکبرآباد۔ دلّی اور پھر لکھنو مسکن آپ کی ولادت کے سن میں اختلاف ہے بعض کے نزدیک ۱۱۲۵ھ اور بعض کے نزدیک ۱۱۳۷ھ ۱۱۲۹ھ یا ۱۱۱۰ھ ہے۔ آپ اکبرآباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کا آبائی مکان بیرون شہر پناہ متصل عیدگاہ تھا۔ آپ کے بزرگ مع اپنے قبیلے کے حجاز سے ہندوستان آئے اور سب سے پہلے دکن میں وارد ہوئے۔ میر صاحب کے دادا اکبرآباد (آگرہ) میں فوجدار دکوتوال بیرون شہر، ہوئے اور یہیں پچاش سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ان کے دو لڑکے تھے۔ بڑے کچھ مجنون سے تھے جن کا ایام شباب میں انتقال ہوا۔ اور دوسرے میر صاحب کے والد۔ یہ اپنے زمانے کے بڑے بزرگ اور کامل تھے۔ اور ہوا خواہ عقیدتمندوں کا ان کے یہاں ہجوم رہتا تھا۔ آپ کی والدہ خان آرزو کی بہن تھیں۔

سات برس تک میر صاحب اپنے والد کی آغوش شفقت میں پرورش پاتے رہے اور رسم زمانہ کے مطابق ان کی تعلیم وتربیت ہوئی بعدہٗ اُن کے والد کے خاص مُرید سیّد امان اللہ نے ان کو درسی اور ضروری کتابیں اور قرآن شریف پڑھایا۔ اور اخلاق وعادات کی بھی درستی میں کماینبغی حصہ لیا۔ کچھ دنوں بعد سیّد امان اللہ کا انتقال ہوا۔ اور پھر ان کے والد بھی رہگرائے جہان باقی ہوئے۔ والد کے انتقال کے بعد تلاش روزگار کے لیے چودہ پندرہ برس کی عمر میں وہ دلّی آئے۔

تو خواجہ محمد باسط نواب صمصام الدولہ امیر الامرا کے بھتیجے کے ذریعے سے نواب صاحب کے دربار میں رسائی ہو گئی۔ اور ایک روپیہ یومیہ مقرر ہو گیا۔ اور یہ سلسلہ چند روز جاری رہا تا اینکہ نادر شاہ کے حملے نے دلّی کو زیر و زبر کیا۔ اور اسی معرکے میں ان کے محسن امیر الامرا صمصام الدولہ بھی جاں بحق ہوئے۔ اور پھر ان کو دشواریوں کا سامنا ہوا۔ اور مجبوراً اکبر آباد لوٹ آئے۔ جہاں اُن کے بھائی محمد رضی تھے۔ مگر چونکہ ان کے اعزّا ان سے ناراض تھے۔ اس لیے مکان پر جی نہ لگا۔ کچھ دنوں رہ کر پھر دلّی آ گئے اور اس مرتبہ اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین علی خاں آرزو کے مکان پر قیام کیا۔ یہاں ان سے کچھ صحبت بر آر نہ ہوئی۔ اور سخت کشاکش میں مبتلا ہو گئے۔ حتّٰی کہ انھیں جنوں کا سا عارضہ لاحق ہو گیا۔ رات دن کوٹھری میں دروازہ بند کیے پڑے رہتے تھے۔ اور نہ معلوم متخیلہ کیا کیا نقش و نگار دکھاتا تھا۔ آخر کار ان کے چند خیر خواہوں نے معالجہ کیا اور وہ عارضہ رفع ہوا۔ اس مرتبہ ایک طالب علم میر جعفر سے بھی ان کی ملاقات ہوئی۔ ان سے بھی اُنھوں نے کچھ پڑھا۔ اور انھیں کی رہنمائی سے یہ سیّد سعادت حسین باشندہ امروہہ سے ملے۔ وہ شاعر تھے۔ انھیں کے فیض صحبت سے ان کو شاعری کا شوق ہوا۔ اور انھیں سے انھوں نے ابتدا میں اصلاح لینا اور مشاعروں میں شرکت کرنا شروع کی طبیعت پہلے ہی سے برق تھی۔ مشق نے شہرت کو پر لگا دیے اور چند روز میں مشہور ہو گئے۔ اور ایسے مشہور ہوئے کہ ہندوستان کا گوشہ گوشہ آج تک اُس سے گونج رہا ہے۔ بعض مورّخوں نے

ان کو آرزو کا شاگرد لکھ دیا ہے ممکن ہے کہ انھوں نے کچھ فارسی عربی اُن سے پڑھی ہو۔ مگر وہ شاعری میں ان کے شاگرد نہ تھے۔

دلّی میں خواجہ میر درد کے یہاں مشاعرہ ہوتا تھا۔ اُس میں میر سوز۔ سودا۔ سجاد وغیرہ شریک ہوتے تھے۔ میر صاحب بھی وہاں جاتے اور غزل پڑھ کر خراج تحسین وصول کرتے۔ اس کے علاوہ میر سجاد کے مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ اب ان کی شہرت اتنی عام ہو گئی کہ رعایت خاں پسر عظیم اللہ خاں اعتماد الدولہ قمر الدین خاں کے داماد ان کا کلام سن کر ملاقات کے مشتاق ہوئے۔ آدمی بھیج کر بلوایا۔ اور زمرۂ مصاحبین میں ان کو ملازم رکھ لیا۔ اور اس ملازمت میں بھی ایک زمانے تک بہ فراغت بسر ہوئی۔ دُرّانیوں کے حملے کے بعد یہ مختلف جگہوں میں پھرتے رہے۔ اور پھر دلّی آ گئے۔ مگر ان سب سیاحتوں کے باوجود بھی وہ تحصیل علم سے کبھی غافل نہ رہے فارسی میں کمال حاصل کیا۔ اور عربی میں مطول تک سبقاً سبقاً پڑھا۔ اس کے بعد دلّی میں مختلف امرا کے ساتھ رہے

ان کے کمال کی شہرت نواب آصف الدولہ تک پہنچی۔ تو انھوں نے نواب سالار جنگ خلف اسحاق خاں موتمن الدولہ سے کہا کہ اگر میر تقی یہاں آ جائیں تو اچھا ہے۔ اُنھوں نے خان آرزو کو لکھا۔ زادِ راہ بھیجا۔ اور میر صاحب کو بُلا لیا۔

یہ روایت قابل وثوق نہیں کہ وہ لکھنؤ میں آکر سرائے میں ٹھہرے اور مشاعرے میں شریک ہو کر یہ قطعہ پڑھا:۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

اُس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

بلکہ وہ لکھنؤ پہنچ کر سالار جنگ کے یہاں مقیم ہوئے جو نہایت تعظیم و تواضع سے پیش آئے۔ اور پھر یہ نواب آصف الدولہ تک پہنچ گئے اور دو سو روپیہ ماہوار پر زمرۂ مصاحبین میں داخل ہو گئے اور عمر بھر فراغت کے ساتھ بسر کرتے اور شعر و سخن کے ہنگاموں میں شریک ہوتے رہے آخر سنہ ۱۲۲۵ھ کو انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔

میر صاحب نہایت سنجیدہ، درویش صفت، غیور، قانع، متوکّل آدمی تھے۔ درد و سوز اُن کے دل میں بھرا تھا۔ اپنے خلاف مزاج بات کی برداشت نہ کر سکتے تھے۔ اور اسی وجہ سے کچھ زود رنج بھی تھے۔

فارسی کے زبردست زباں داں۔ اُردو کے کامل اہلِ زباں، عربی سے باخبر تھے جس کا اُن کی تصنیفوں، ذکرِ میر، فیض میر، نکات الشعرا سے پتہ چلتا ہے۔ اُن کی شاعری میں مندرجہ ذیل خصوصیات ہیں۔ نہایت سادہ، متین، درد و اثر سے لبریز ہے، مایوسی اور غم کے مضامین اُن کے یہاں بہت ہیں۔ غزلیں، قصیدے، مثنویاں، رباعیاں، مرثیے، قطعے، غرض کہ تمام اصناف کلام کے اوپر قادر تھے غزلیں نہایت عمدہ زبان میں ہیں۔ مثنوی میں میر حسن۔ اور قصیدوں میں سودا سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ لوگوں نے سودا کو ان کا حریف ٹھہرایا ہے۔ مگر دونوں کے کلام میں آہ اور واہ کا فرق ہے۔ یہ سراپا درد ہیں وہ سراپا شوخی، پھر بھی زمانے کی روش نے دونوں کے یہاں مماثلت پیدا کر دی ہے۔ ذیل میں اُن کے کلّیات کے

چند غزلیں درج کی جاتی ہیں :-

دل عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا ۔ اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا
اک گرد راہ تھا پئے محمل تمام راہ ۔ کس کا غبار تھا کہ یہ دنبالہ گرد تھا
دل کی شکستگی نے ڈرائے رکھا ہمیں ۔ واں چیں جبیں پر آئی کہ یاں رنگ زرد تھا
مانند حرف صفحۂ ہستی سے اُٹھ گیا ۔ دل بھی مرا جریدۂ عالم میں فرد تھا
تھا پشتہ ریگ بادیہ اک وقت کارواں ۔ یہ گردباد کوئی بیاباں نورد تھا
گزری مدام اُس کی جوانانِ مست میں ۔ پیر مغاں بھی طرفہ کوئی پیر مرد تھا

عاشق ہیں ہم تو میر کے بھی ضبط عشق کے
دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

گل کی جفا بھی جانی دیکھی وفائے بلبل ۔ یک مشت پر پڑے ہیں گلشن میں جائے بلبل
کر میر جذب الفت گلچیں نے کل چمن میں ۔ توڑا تھا شاخِ گل کو نکلی صدائے بلبل
کھٹکے ہیں خار ہو کر ہر شب دلِ چمن میں ۔ اتنی لب و دہن پر یہ نالہائے بلبل
یک رنگیوں کی راہیں طے کر کے مر گیا ہے ۔ گل میں رگیں نہیں ہیں یہ ہیں نقوش پائے بلبل
آئی بہار گلشن گل سے بھرا ہے لیکن ۔ ہر گوشۂ چمن میں خالی ہے جائے بلبل
پیغام بے غرض بھی سنتے نہیں ہیں خوباں ۔ پہنچی نہ گوش گل تک آخر دعائے بلبل

یہ دل خراش نالے ہر شب کے میر تیرے
کر دیں گے بے نمک ہی شورِ نوائے بلبل

جو جو ظلم کیے ہیں تم نے سو سو ہم نے اُٹھائے ہیں
داغ جگر پہ جلائے ہیں چھاتی پہ جراحت کھائے ہیں
تیغ دریغ نہیں ہے اُس کی بسمل گہ میں کسو سے بھی
ہیں تو شکار لاغر ہم پر ایک امید پہ آئے ہیں

خم سے لگی مے خانے کے دیوار بھی اپنے گھر کی ہے
لطف پیر مغاں سے عجب کیا ہم آخر ہمسائے ہیں

شوق ہے غم میں بے صبری ہے آہ کسو کو کیا کہیے
اچھے اپنے دل کو ہم نے آپ ہی روگ لگائے ہیں

محو سخن میں فکر سخن میں رفتہ ہی بیٹھے رہتے ہیں
آپ کو جب سے کھویا ہم نے تب سے گوہر پائے ہیں

تب تھے سپاہی اب ہیں جوگی آہ جوانی یوں کاٹی
ایسی تھوڑی رات میں ہم نے کیا کیا سوانگ بنائے ہیں

کون وہ ایسا ظالم تھا استاد فن عیاری کا
اتنے سن میں جس نے تجھ کو ایسے فریب سکھائے ہیں

میر مقدس آدمی ہی تھے سبحہ بہ کف میخانے میں
صبح جو ہم بھی جا نکلے تو دیکھ کے کیا شرمائے ہیں

جیتے جی کوچۂ دلدار سے جایا نہ گیا — اُس کی دیوار کا سر سے مرے سایا نہ گیا
کاو کاوِ مژۂ یار و دلِ زار و نزار — گتھ گئے ایسے شتابی کہ چھڑایا نہ گیا
وہ تو کل دیر تلک دیکھتا ایدھر کو رہا — ہم سے ہی حال تباہ اپنا دکھایا نہ گیا
گرم رو راہ فنا کا نہیں ہو سکتا پتنگ — اس سے تو شمع نمط سر بھی کٹایا نہ گیا
پاس ناموس محبت تھا کہ فرہاد کے پاس — بیستوں سامنے سے اپنا اُٹھایا نہ گیا
خاک تک کوچۂ دلدار کی چھانی ہم نے — جستجو کی پہ دل گم شدہ پایا نہ گیا
آتش تیز جدائی میں یکایک اُس بن — دل جلا یوں کہ تنک جی بھی جلایا نہ گیا
مہ نے آ سامنے شب یاد دلایا تھا اُسے — پھر وہ تا صبح مرے جی سے بھلایا نہ گیا
زیر شمشیر ستم میر تڑپنا کیسا — سر بھی تسلیم محبت میں ہلایا نہ گیا

گل میں اُس کی سے جو بُو آئی تو آیا نہ گیا
ہم کو بن دوش ہوا باغ سے لایا نہ گیا

آہ جو نکلے ہے منہ سے تو افلاک کے پاس
اُس کے آشوب کے عہدے سے برایا نہ گیا

گل نے ہرچند کہا باغ میں رہ پر اُس بن
جی جو اُچٹا تو کسی طرح لگایا نہ گیا

سر نشین رہ میخانہ ہوں میں کیا جانوں
رسم مسجد کے تئیں شیخ کہ آیا نہ گیا

حیف ہے جن کے وہ اس وقت میں پہنچا جس وقت
اُن سکنے حال اشاروں سے بتایا نہ گیا

خطرِ راہِ محبت کہیں جوں حرف مٹے
جس سے اُس طرف کو قاصد بھی چلایا نہ گیا

خوف آشوب سے غوغائے قیامت کیلیے
خون خوابیدۂ عشاق جگایا نہ گیا

میر مت عذر گریباں کے پھٹے رہنے کا کر
زخم دل چاک جگر تھا کہ سِلایا نہ گیا

تھا مستعار[1] حسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اُس ہی[2] کا ذرّہ ظہور تھا

مجلس میں رات ایک ترے پرتوے بغیر
کیا شمع کیا پتنگ ہر اک بے حضور[3] تھا

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا
یکسر وہ اُستخوان شکستوں سے چور تھا ق

کہنے لگا کہ "دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھی کسی کا سرِ پُرغرور تھا

تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میر
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا
کل اُس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت؟
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

یہ زخم جگر داورِ محشر سے ہمارا
انصاف طلب ہے تری بیدادگری کا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کے اس کارگہِ شیشہ گری کا

---

[1] عارضی [2] آج کل اُسی کا فصیح ہے [3] غیر حاضر

جب جنوں سے ہمیں توسّل تھا　　اپنی زنجیر پائی کا غل تھا
بسترا تھا چمن میں جوں بلبل　　نالہ سرمایۂ توکّل تھا
اِک نگہ کو وفا نہ کی گویا　　موسمِ گل صفیرِ بلبل تھا
اب تو دل کو نہ تاب ہے نہ قرار　　یادِ ایّام جب تحمّل تھا
خوب دریافت جو کیا ہم نے
وقتِ خوش میرؔ نکہتِ گل تھا

دل و دماغ ہے اب کس کو زندگانی کا؟　　جو کوئی دم ہے تو افسوس ہے جوانی کا
اگرچہ عمر کے دس دن یہ لب رہے خاموش　　سخن رہے گا سدا میری کم زبانی کا
ہزار جان سے قربان بے پری کے ہیں
خیال ہی کبھی گزرا نہ پرفشانی کا

گل و بلبل بہار میں دیکھا　　ایک تجھ کو ہزار میں دیکھا
جل گیا دل، سفید ہیں آنکھیں　　یہ تو کچھ انتظار میں دیکھا
تیرہ عالم ہوا یہ روز سیاہ[1]　　اپنے دل کے غبار میں دیکھا
جن بلاؤں کو میرؔ سنتے تھے
اُن کو اس روزگار میں دیکھا

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا؟　　آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟
قافلے میں صبح کے اک شور ہے　　یعنی غافل! ہم چلے سوتا ہے کیا؟
سیر ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں　　تخمِ خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا؟
یہ نشانِ عشق ہیں جاتے نہیں　　داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا؟
غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز　　میرؔ اس کو رائگاں کھوتا ہے کیا؟

---

[1] روز بد. فقرہ روز سیاہ اگلے مصرع سے متعلق ہے یعنی اپنے دل کے غبار میں روز سیاہ (بد) دیکھا

بارہا گور دل جھکا لایا — اب کی شرطِ وفا بجا لایا
قدر رکھتی نہ تھی متاعِ دل — سارے عالم میں مَیں دکھا لایا
دل کہ اک قطرۂ خوں نہیں ہے بیش — ایک عالم کے سر بلا لایا
سب پہ جس بار نے گرانی کی — اُس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا
دل مجھے اُس گلی میں لے جا کر — اور بھی خاک میں ملا لایا

اب تو جاتے ہیں بتکدہ سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

جو اس شور سے میر روتا رہے گا — تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا؟
میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں — جسے ابر ہر سال روتا رہے گا؟
مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح — تو کب تک مرے مُنہ کو دھوتا رہے گا؟
بس اے گریہ آنکھیں ترے کیا نہیں ہیں؟ — کہاں تک جہاں کو ڈبوتا رہے گا؟
مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے — جرس کے بھی جو ہوش کھوتا رہے گا؟

بس اے میر مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو
تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

فقیرانہ آئے صدا کر چلے — میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
شفا اپنی تقدیر ہی میں نہ تھی — کہ مقدور تک تو دوا کر چلے
وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لیے — ہر اک چیز سے دل اُٹھا کر چلے
کوئی نا اُمید انہ کرتے نگاہ — سو تم ہم سے مُنہ بھی چھپا کر چلے
بہت آرزو تھی گلی کی ترے — سو یاں سے لہو میں نہا کر چلے
دکھائی دیے یوں کہ بیخود کیا — ہمیں آپ سے بھی جُدا کر چلے

لہ اب کم استعمال ہوتا ہے مگر بالکل متروک نہیں۔ یہ حرفِ جزا ہے۔

جبیں سجدہ کرتے ہی کرتے گئی
حقِ بندگی ہم ادا کر چلے
نہ دیکھا غمِ دوستاں شکر ہے
ہمیں داغ اپنا دکھا کر چلے
کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میرؔ
جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے

عمر بھر ہم رہے شرابی سے
دل پُرخوں کی اک گلابی سے
جی ڈھہا جائے ہے سحر سے آہ
رات گزرے گی کس خرابی سے
کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اُس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے
بُرقع اُٹھتے ہی چاند سا نکلا
داغ ہوں اُس کی بے حجابی سے
کام تھے عشق میں بہت پر میرؔ
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

سوالات

۱۔ "میرؔ کی شاعری اور ان کی زندگی میں بڑی ہم آہنگی ہے"۔ بحث کیجیے۔

۲۔ میرؔ کی خصوصیاتِ شاعری بیان کیجیے۔

۳۔ میرؔ کا فلسفۂ غم کیا ہے؟

خواجہ میر درد

سید خواجہ میر نام تھا اور تخلص درد۔ ان کا سلسلۂ نسب خواجہ بہاء الدین نقش بندی سے ملتا ہے اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ شاعری اور تصوف ان کو ورثہ میں ملا تھا۔

کسی نے عارفانہ شاعری کے ساز کو اس جوش کے ساتھ نہیں چھیڑا جیسا کہ خواجہ میر درد نے۔ آزاد نے صحیح لکھا ہے کہ ان کی جو غزل ہوتی ہے وہ لاجواب۔ وہ گویا تلواروں کی آبداری نشتر میں بھر دیتے ہیں۔ میر کے یہاں ایک خستگی کھلی ہوئی سپردگی اور عاشقانہ اُفتادگی ہے۔ درد کے یہاں والہانہ ربودگی اور عارفانہ سوز و گداز ہے۔ ان کا عشق پاکیزہ ہے اور آسودگی سے خالی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تصوف کے اشعار جیسے انھوں نے لکھے ہیں کسی دوسرے کے یہاں نہیں ملتے۔

درد نے زبان کی اصلاح میں بھی حصّہ لیا اور اُردو غزل میں عارفانہ مضامین شامل کر کے اس کو بہت نفیس اور پاکیزہ بنا دیا۔

امیر مینائی نے صحیح لکھا ہے کہ درد کے شعر پسی ہوئی بجلیاں معلوم ہوتی ہیں ان کے یہاں جو سوز و گداز ہے، جو سادگی اور اثر ہے وہ اُردو میں دوسری جگہ نہیں ملتا ہے۔

رام بابو سکسینہ نے لکھا ہے کہ ان کے دیوان اُردو کو اُردو شاعری کے تاج کا سب سے بڑا ہیرا سمجھنا چاہیے۔ درد کی زبان اور طرزِ ادا تقریباً وہی ہے جو میر کا ہے لیکن ہر شعر میں درد و اثر کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ عرفان اور تصوّف کے پیچیدہ اور مشکل مضامین

اس خوبصورتی کے ساتھ بیان کیے ہیں کہ دل وجد کرتا ہے۔

میر حسن نے صحیح لکھا ہے کہ ان کا کلام اگرچہ مختصر ہے لیکن حافظ شیرازی کی طرح منتخب ہے۔

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کے رقم کا؟　　حقّا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا

بستے ہیں ترے سایہ میں سب شیخ و برہمن　　آباد تجھی سے تو ہے گھر دیر و حرم کا

ہے خوف اگر جی میں، تو ہے تیرے غضب سے　　اور دل میں بھروسا ہے، تو ہے تیرے کرم کا

مانندِ حباب آنکھ تو اے دردؔ کھلی تھی
کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بُت خانہ تھا　　ہم بھی مہمان تھے واں تو ہی صاحب خانہ تھا

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا　　خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

حیف کہتے ہیں ہوا گلزارِ تاراجِ خزاں　　آشنا اپنا بھی واں اک سبزۂ[1] بیگانہ تھا

ہو گیا مہماں سرائے کثرتِ موہوم آہ
وہ دلِ خالی جو تیرا خاص خلوت خانہ تھا

اگر یوں ہی یہ دل ستاتا رہے گا　　تو اک دن مرا جی ہی جاتا رہے گا

میں جاتا ہوں دل کو ترے پاس چھوڑے　　مری یاد تجھ کو دلاتا رہے گا

گلی سے ترے دل کو لے تو چلا ہوں　　میں پہنچوں گا جب تک یہ آتا رہے گا

جفا سے غرض امتحانِ وفا ہے　　تو کہہ کب تلک[2] آزماتا رہے گا

خفا ہو کے اے دردؔ مر تو چلا تو
کہاں تک غم اپنا چھپاتا رہے گا

---

[1] سبزۂ بیگانہ وہ خود رَو گھاس جو عموماً باغ سے چھیل کر پھینک دی جاتی ہے یا یہ کہ وہ الگ ہوتی ہے اس لیے بیگانہ کہا گیا [2] تلک کو اب اکثر شعرا کم لکھتے ہیں بالکل متروک نہیں۔

دنیا میں کون کون نہ یکبار ہو گیا
پر[1] منہ پھر اس طرف نہ کیا اُس نے جو گیا

پھرتی ہے میری خاک صبا دربدر لیے
اے چشمِ اشکبار! یہ کیا تجھ کو ہو گیا

طوفانِ نوح نے تو ڈبائی زمیں فقط
میں ننگ خلق ساری خدائی ڈبو گیا

آیا نہ اعتدال پہ ہرگز مزاجِ دہر
میں گرچہ گرم و سرد زمانہ سمو[2] گیا

اے دردؔ جس کی آنکھ کھلی اس جہان میں
شبنم کی طرح جان کو اپنی وہ رو گیا

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا
برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

یگانہ ہے تو آہ بیگانگی میں
کوئی دوسرا اور ایسا نہ دیکھا

اذیت مصیبت ملامت بلائیں
ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

کیا مجھ کو داغوں نے سروِ چراغاں[3]
کبھی تو نے آکر تماشا نہ دیکھا

تغافل نے تیرے یہ کچھ دن دکھائے
اِدھر تو نے لیکن نہ دیکھا نہ دیکھا

حجابِ رخِ یار تھے آپ ہی ہم
کھُلی آنکھ جب کوئی پردہ نہ دیکھا

شب و روز اے دردؔ درپے ہوں اس کے
کسی نے جسے یاں نہ سمجھا نہ دیکھا

گلیم بخت سیہ سایہ دار رکھتے ہیں
یہی بساط میں ہم خاکسار رکھتے ہیں

بلا ہے نشۂ دنیا کہ تا قیامت آہ!
سب اہلِ قبر اسی کا خمار رکھتے ہیں

ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تجھ پر؟
مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں

فلک سمجھ تو سہی ہم سے اور گلوگیری
یہ ایک جیب ہے سو تار تار رکھتے ہیں

---

[1] پر بمعنی مگر بالکل متروک نہیں ہے [2] سمونا ملانا صحیح لفظ عوام سمانا بولتے ہیں اور فصحا سمونا
[3] لکڑی یا کسی دھات کا ایک درخت جس میں پتّے اور ٹہنیاں بنا کر چراغ دان کا کام لیتے ہیں اور اکثر آرائش وغیرہ کے موقع پر ایسا جھاڑ جلا کرتا تھا اُسے سروِ چراغاں کہتے تھے۔

نہ برق ہیں نہ شرر ہم نہ شعلہ نے سیلاب   وہ کچھ ہیں، پر کہ سدا اضطرار رکھتے ہیں

وہ زندگی کی طرح ایک دم نہیں رہتا
اگرچہ دردؔ اُسے ہم ہزار رکھتے ہیں

کیا فرق داغ و گل میں کہ جس گل میں بُو نہو؟   کس کام کا وہ دل ہے کہ جس دل میں تو نہو؟

جو کچھ کہ ہم نے کی ہے، تمنا ملی، مگر
یہ آرزو رہی ہے کہ کچھ آرزو نہو

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے   میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

وحدت میں تیری حرف دوئی کا نہ آ سکے   آئینہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے

قاصد، نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے   اِس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

یارب یہ کیا طلسم ہے ادراک و فہم یاں   دوڑے ہزار آپ سے باہر نہ جا سکے

گو بحث کرکے بات بٹھائی، پہ کیا حصول
دل سے اُٹھا غلاف اگر تو اُٹھا سکے

تہمت چند اپنے ذمے دھر چلے   جس لیے آئے تھے سو ہم کر چلے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے؟   ہم تو اِس جینے کے ہاتھوں مر چلے

دوستو! دیکھا تماشا یاں کا بس   تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے

شمع کے مانند ہم اس بزم میں   چشم نم آئے تھے دامن تر چلے

سوالات

۱۔ ”دردؔ کی والہانہ ربودگی نے تغزل میں ایک معیاری شان پیدا کر دی“ توضیح کیجیے۔

۲۔ تصوف نے اُردو شاعری کی کیا خدمات انجام دیں۔

۳۔ دردؔ کے سوانح حیات اور سیرت و کردار پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

مرزا محمد رفیع سودا

پیدائش دلّی ۱۱۲۵ھ
وفات لکھنؤ ۱۱۹۵ھ

سودا تخلص۔ مرزا محمد رفیع نام۔ شہر دہلی کو اُن کے کمال سے فخر تھا۔ ان کے باپ مرزا محمد شفیع میرزایان کابل سے تھے۔ بزرگوں کا پیشہ سپہ گری تھا۔ مرزا محمد شفیع بطریق تجارت وارد ہندوستان ہوئے۔ ہند کی خاک دامنگیر نے ایسے قدم پکڑے کہ یہیں رہے۔

سودا ۱۱۲۵ھ میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں پرورش اور تربیت پائی۔ کابلی دروازے کے علاقہ میں اِن کا گھر تھا۔ بموجب رسم زمانہ پہلے سلیمان قلی خاں وداد کے پھر شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے۔ خان آرزو کے شاگرد نہ تھے۔ مگر اُن کی صحبت سے فائدے بہت حاصل کیے چنانچہ پہلے فارسی شعر کہا کرتے تھے۔ خانّ آرزو کی فہمائش سے اُردو زبان میں شعر کہنے لگے۔ طبیعت کی مناسبت اور مشق کی کثرت سے دلّی جیسے شہر میں اِن کی اُستادی نے خاص و عام سے اقرار لیا۔ کہ ان کے سامنے ہی اِن کی غزلیں گھر گھر اور کوچہ و بازار میں خاص و عام کی زبانوں پر جاری تھیں۔

جب کلام کا شہرہ عالمگیر ہوا۔ تو شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام اصلاح کے لیے دینے لگے۔ مرزا بڑے نازک مزاج اور نہایت غیور تھے۔ ایک دن کسی بات پر بادشاہ سے ناراض ہو گئے۔ ہر چند بادشاہ نے بلوایا۔ نہ گئے۔ دلّی کے اکثر اُمرا خصوصاً مہربان خاں اور بسنت خاں اِن کی بڑی قدر کرتے تھے۔ فارغ البالی سے بسر کرتے تھے۔

جب اِن کے کلام کا شہرہ لکھنؤ تک پہنچا۔ تو نواب شجاع الدولہ نے



مرزا محمد رفیع سودا

کمال اشتیاق سے خط لکھ کر خرچ سفر بھیجا۔ اور طلب کیا۔ اُنھیں دِلّی چھوڑنا گوارا نہ ہوا۔ جواب میں فقط اِس رُباعی پر حسن معذرت کو ختم کیا۔

سوداؔ پئے دنیا تو بہر سو کب تک؟ آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک؟
حاصل یہی اِس سے نہ کہ دنیا ہوئے بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک؟

کئی برس کے بعد وہ قدردان مر گئے۔ زمانے بدل گئے۔ سوداؔ بہت گھبرائے۔ ساٹھ پینسٹھ برس کی عمر میں ان کو دِلّی چھوڑنا پڑا۔ چند روز فرخ آباد میں نواب بنگش کے پاس رہے۔ وہاں سے لکھنؤ پہنچے۔ نواب شجاع الدولہ کی ملازمت حاصل کی۔ وہ بہت اعزاز سے ملے۔ اور اِن کے آنے پر کمال خورسندی ظاہر کی لیکن یا تو بے تکلفی سے یا طنز سے اتنا کہا کہ "مرزا وہ رُباعی تمھاری اب تک میرے دل پر نقش ہے"۔ اور اُسی کو مکرر پڑھا۔ انھیں اپنے حال پر بڑا رنج ہوا۔ اور بپاس وضعداری پھر دربار نہ گئے۔ یہاں تک کہ شجاع الدولہ مر گئے۔ نواب شجاع الدولہ کے بعد اُن کے بیٹے نواب آصف الدولہ نے چھ ہزار روپیہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ اور نہایت عزت سے اُن کو رکھا۔ تقریباً ۷۰ برس کی عمر میں ۱۱۹۵ھ میں وہیں انتقال کیا۔

سوداؔ اُردو کے مسلم الثبوت اُستاد ہیں۔ انھوں نے تقریباً تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ مگر اُردو میں قصائد کا کہنا اور پھر اِس دھوم دھام سے اعلیٰ درجۂ فصاحت و بلاغت پر پہنچانا۔ اِن کا پہلا فخر ہے۔ وہ اِس میدان میں فارسی کے نامی شہسواروں کے ساتھ عناں درعناں ہی نہیں گئے۔ بلکہ اکثر میدانوں میں آگے نکل گئے ہیں۔ اِن کے کلام کا زور شور انوری اور خاقانی کو دباتا ہے۔ اور نزاکت مضمون میں عرفی و ظہوری کو شرماتا ہے۔

مرزا کے کلام کے خصوصیات۔ زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں۔

کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و گریبان ہے۔ جیسے آگ کے شعلے میں گرمی اور روشنی۔ بندش کی چستی و ترتیب کی درستی سے لفظوں کو اس دروبست کے ساتھ پہلو بہ پہلو جڑتے ہیں۔ گویا ولایتی طپنچہ کی چاپیں جڑی ہوئی ہیں۔ اور یہ خاص اِن کا حصہ ہے۔ خیالات نازک اور مضامین تازہ باندھتے ہیں۔ تشبیہ اور استعارے بھی اِن کے کلام میں ہیں۔ مگر اتنے جیسا کھانے میں نمک۔ اِن کی طبیعت ایک ڈھنگ کی پابند نہ تھی نئے نئے خیال اور قافیے جس پہلو سے جمتے دیکھتے جما دیتے تھے۔ جن اشخاص نے زبانِ اُردو کو پاک صاف کیا ہے۔ مرزا کا اِن میں پہلا نمبر ہے۔ انھوں نے فارسی محاوروں کو بھاشا میں کھپا کر ایسا ایک کیا ہے۔ جو کہیں سے جُدا نہیں معلوم ہوتے۔ ہندی زبان کو فارسی محاوروں اور استعاروں سے نہایت زور بخشا ہے۔ انھیں کا زورِ طبع تھا کہ جس کی نزاکت سے ۲ دو زبانیں ترکیب پا کر تیسری زبان پیدا ہو گئی۔ اور ایسی قبولیت عام حاصل ہوئی کہ آیندہ کے لیے وہی ہندوستان کی زبان ٹھہری۔ جس نے حکّام کے درباروں اور علوم کے خزانوں پر قبضہ کر لیا۔

مرزا قصیدے کے بادشاہ ہیں۔ مگر غزل میں میرؔ کے برابر سوز و گداز نہیں۔ تصوّف اِن کا حصہ نہیں۔ وہ میر دردؔ کے حصّے کا مضمون ہے۔

دامن صبا نہ چھوڑ سکے جس سوار کا ۔۔۔ پہنچے کب اس کو ہاتھ ہمارے غبار کا

موجِ نسیم آج ہے آلودہ گرد سے ۔۔۔ دل خاک ہو گیا ہے کسی بے قرار کا

سونپا ہے کیا جنوں نے گریبان کو مرے ۔۔۔ لیتا ہے اب حساب جو یہ تار تار کا

سوداؔ شراب عشق نہ کہتے تھے ہم نہ پی
پایا مزا نہ تو نے اب اُس کے خمار کا

ٹوٹے تری نگہ سے اگر دل حباب کا
پانی بھی پھر پئیں تو مزہ ہو شراب کا

دوزخ مجھے قبول ہے اے منکر و نکیر
لیکن نہیں دماغ سوال و جواب کا

تھا کس کے دل کو کشمکشِ عشق کا دماغ
یارب بُرا ہو دیدۂ خانہ خراب کا

سودا نگاہِ دیدۂ تحقیق کے حضور
جلوہ ہر ایک ذرّے میں ہے آفتاب کا

دل میں ترے جو کوئی گھر کر گیا
سخت مہم تھی کہ وہ سر کر گیا

نفع کو پہنچا یہ مجھے دے کے دل[1]
جان کا میں اپنی ضرر کر گیا

دیکھیے واماندگی اب کیا دکھائے
قافلہ یاروں کا سفر کر گیا

فیض ترے وصفِ بناگوش کا
حرف کو سودا کے گہر کر گیا

گر کیجیے انصاف تو کی زور وفا میں
خط آتے ہی سب چل گئی اب آپ ہیں یا میں

تم جن کی ثنا کرتے ہو کیا بات ہے اُن کی
لیکن ٹک ادھر دیکھیو اے یار بھلا میں

رکھتا ہے کچھ ایسی وہ برہمن بچہ رفتار
بُت ہو گیا دیکھ کے اُس کی بخدا میں

یاروں نہ بندھی اُس سے کبھو شکل ملاقات
ملنے کو تو اُس شوخ سے ترسا ہی کیا میں

جب میں گیا اُسکے تو اُسے گھر میں نہ پایا
آیا وہ اگر میرے تو در خود نہ رہا میں

کیفیتِ چشم اُس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجیو کہ چلا میں

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

---

[1] یعنی نفع پانا۔

کیونکر نہ چاک چاک گریبان دل کروں
دیکھوں ہوں تیری زلف کو میں دست شانے میں
زینت دلیل مفلسی ہے تک کماں کو دیکھ
نقش ونگار چھٹ نہیں کچھ اس کے خانے میں
اے مرغِ دل سمجھ کے تو چشم طمع کو کھول
تو نے سُنا ہے دام جسے ہے وہ دانے میں
چلّے میں کھینچ کھینچ کیا قد کو جوں کماں
تیر مراد پر نہ بٹھایا نشانے میں
پایا ہر ایک بات میں اپنے میں یوں تجھے
معنی کو جس طرح سخن عاشقانے میں
دست گرہ کشا کو نہ تزئیں کرے فلک
مہندی بندھی نہ دیکھی میں انگشت شانے میں
ہما تجھے تو ایک ہیں تجھ سے ہیں کئی
جا دیکھ لے تو آپ کو آئینہ خانے میں
سودا خدا کے واسطے کر قصّہ مختصر
اپنی تو نیند اُڑ گئی تیرے فسانے میں

جی تنگ تو دے کے لوں جو ہو تو گا رگر کہیں
اے آہ کیا کروں نہیں بکتا اثر کہیں
ہوتی نہیں ہے صبح نہ آتی ہے مجکو نیند
جس کو پکارتا ہوں سو کہتا ہے مر کہیں

ساقی ہے اک تبسم گل فرصت بہار
ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں

پھرنے لگے تو جوں کف دریا بہا بہا
دامن اگر نچوڑ یے اسے ابر تر کہیں

جادو بھرے ہیں چشم میں مست آئنہ کو دیکھ
دھڑکے ہے دل مرا کہ نہ پلٹے نظر کہیں

دل آہ شعلہ بار کے ہر دم پھرے ہے گرد
پروانہ آسکے ہے مری شمع پر کہیں

خوناب یوں کبھو نہ مری چشم سے بہا
اٹکا نہ جب تک آن کے لخت جگر کہیں

مُنہ تو مجھے لگا دے تو کب جام کی طرح
اتنا بھی واہ واہ ہے میسر ہو گر کہیں

صحبت میں تیری آن کے جوں شیشۂ شراب
خالی کروں میں دل کے تئیں بیٹھ کر کہیں

اے دل یہ کہہ تو مجھ سے کہ میں کیا کروں نثار
آویں کبھو جو حضرت سودا ادھر کہیں

سوالات

۱۔ "شیفتہ نے لکھا ہے کہ سودا کے قصیدے غزل سے اچھے ہیں اور غزل قصیدے سے اچھی ہے" آپ کی کیا رائے ہے ؟

۲۔ سودا اور میر نے زبان کی کیا خدمات انجام دیں ؟

۳۔ سودا اور میر کی شاعری کے امتیازی اوصاف بیان کیجیے ۔

آتش

خواجہ آتش کی ولادت فیض آباد میں ہوئی۔ چونکہ سن طفولیت ہی میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تھا کوئی کہنے سُننے والا نہ رہا۔ فوج کے لڑکوں کی صحبت میں بانکے اور شورہ پشت ہو گئے۔ اور نواب محمد تقی خاں شاگرد میر سوز کے ملازم ہو کر لکھنؤ میں آ گئے۔ اُس زمانے میں جرأت اور مصحفی کی زمین سخن پر حکمرانی تھی۔ اور گھر گھر اُن کا طوطی بول رہا تھا۔ یہ بھی مصحفی کے شاگرد ہو گئے۔ خواجہ صاحب نے لکھنؤ میں نواز گنج چوپٹیوں کے قریب ماہو لال کی چڑھائی کے پاس ایک باغیچہ خرید لیا تھا۔ وہیں رہتے تھے۔ آخر زمانے میں معالی خاں کی سرائے میں اُٹھ آئے تھے۔

نہایت آزاد خیال، بے تعصب۔ بے باک، سیر زاہش، درویشی پسند پابند وضع تھے۔ بادشاہ کے یہاں سے پچاس یا اسّی روپیہ مہینہ ملتا تھا اُسی میں گزران کرتے تھے۔ شاگردوں یا اُمراء سے جو امداد ہوتی وہ اس کے علاوہ تھی۔ اولاد میں محمد علی نام ایک لڑکا تھا۔ وہ بھی شاعر تھا۔ جوش تخلص تھا اور باپ کا نہایت مطیع فرمان تھا۔ بیوی کے مرنے کے بعد ان کی آنکھیں بھی جاتی رہی تھیں۔ شیخ ناسخ شاعری میں ان کے حریف و معاصر تھے۔ اور اکثر دوش بدوش غزلیں پڑھتے۔ مگر جو سوز و برجستگی ان کے کلام میں ہے وہ ناسخ کے یہاں نہیں اور جو بلندی اور نازک خیالی ناسخ کے یہاں ہے وہ ان کے یہاں موجود نہیں۔ البتہ زبان میں دونوں کا ایک درجہ ہے۔ ان کے شاگردوں میں

زند۔ خلیل۔ شنا ور۔ صبا نہایت مشہور ہیں۔

خواجہ آتش کا سرمایۂ عمر شاعری صرف غزل ہے اور کسی صنف میں ان کا کلام نہیں۔ غزلوں میں وارستگی۔ درد و اثر نشتریت بہت زیادہ ہے۔ پرگوئی کی وجہ سے یا زمانے کی روش کے سبب سے ان کے کلام میں بعض بے اعتدالیاں بھی ہیں جو قابل توجہ نہیں ان سے دو دیوان یادگار ہیں جن میں سے بعض غزلیں درج ذیل ہیں:۔

دہن پر ہیں اُن کے گماں کیسے کیسے
کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

تمہارے شہیدوں میں داخل ہوئے ہیں
گل و لالہ و ارغواں کیسے کیسے

بہار آئی ہے نشہ میں جھومتے ہیں
مریدان پیر مغاں کیسے کیسے

عجب کیا چھٹا روح سے جامۂ تن
لٹے راہ میں کارواں کیسے کیسے

تپ ہجر کی کاہشوں نے کیے ہیں
جدا پوست سے استخواں کیسے کیسے

نہ مڑ کر بھی بے درد قاتل نے دیکھا
تڑپتے رہے نیم جاں کیسے کیسے

نہ گورِ سکندر نہ ہے قبر دارا
مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے

بہارِ گلستاں کی ہے آمد آمد
خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے

توجہ نے تیری ہمارے مسیحا
توانا کیے ناتواں کیسے کیسے

دل و دیدۂ اہل عالم میں گھر ہے
تمہارے لیے ہیں مکاں کیسے کیسے

غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

تری کلک قدرت کے قرباں آنکھیں
دکھائے ہیں خوشرو جواں کیسے کیسے

کرے جس قدر شکر نعمت وہ کم ہے
مزے لوٹتی ہے زباں کیسے کیسے

خوشا وہ دل کہ ہو جس دل میں آرزو تیری
خوشا دماغ جسے تازہ رکھے بو تیری

یقیں ہے اٹکے گی جاں اپنی آکے گردن میں
سنا ہے جا ہے قریب رگِ گلو تیری

وہ گُل ہوں میں کہ ترا رنگ جس سے ظاہر ہے
وہ غنچہ ہوں کہ بغل میں ہے جس کی بو تیری

پھرے ہیں مشرق و مغرب سے تا جنوب و شمال
تلاش کی ہے صنم ہم نے چارسو تیری

شبِ فراق میں اک دم نہیں قرار آیا
خدا گواہ ہے شاہد ہے آرزو تیری

دماغ اپنا بھی اے گلبدن معطر ہے
صبا ہی کے نہیں حصے میں آئی بو تیری

پڑھا ہے ہم نے بھی قرآں قسم ہے قرآں کی
جواب ہی نہیں رکھتی ہے گفتگو تیری

مری طرف سے صبا کہیو میرے یوسف سے
نکل چلی ہے بہت پیرہن سے بو تیری

فرشتے بھی مجھے کہتے ہیں بشر شاعر
یقیں ہوا ملک الموت میں ہے خو تیری

یہ گردشِ فلکِ پیر سے ہوا ثابت
قوی ضعیف کو کرتی ہے جستجو تیری

شراب شرم و حیا و حجاب کھو دے گی
دکھائے گا ہمیں کیفیتیں سبو تیری

رہا نہ شبہ ہمیں اُس کے حلقہ ہونے سے
یہ عقدہ ناف نے کھولا کمر ہے مو تیری

ہوا جو دسترس اس کا بھی پائے قاتل تک
حنا بھلائے گا شوخی مرا لہو تیری

شبِ فراق میں اے روزِ وصل تا دمِ صبح
چراغ ہاتھ میں ہے اور جستجو تیری

جو ابر گریہ کناں ہے تو برق خندہ زناں
کسی میں خو ہے ہماری کسی میں خو تیری

یہ چاکِ جیب کے حق میں دعائے مجنوں ہے
نہ ہو وہ دن کہ درستی کرے رفو تیری

کسی طرف سے تو نکلے گا آخر اے شہِ حسن
فقیر دیکھتے ہیں راہ کو بہ کو تیری

چمن میں صبح کو جا کر نہ منہ دکھانا تھا
برنگِ آئینہ حیراں ہے آبجو تیری

زمانے میں کوئی تجھ سا نہیں ہے سیفِ زباں
رہے گی معرکہ میں آتشِ آرزو تیری

ہستی کو مثلِ نقشِ کفِ پا مٹا چکے / عاشق نقابِ شاہدِ مقصود اُٹھا چکے

کعبہ سے دیر، دیر سے کعبہ کو جا چکے / کیا کیا نہ اس دوراہے میں ہم پھیر کھا چکے

گستاخ ہاتھ طوقِ کمرِ یار کے ہوئے / حدِّ ادب سے پاؤں کو آگے بڑھا چکے

کنعاں سے شہرِ مصر میں یوسف کو لے گئے / بازار میں بھی حسن کو آخر دکھا چکے

پہنچے تڑپ تڑپ کے بھی جلّاد تک نہ ہم / طاقت سے ہاتھ پاؤں زیادہ ہلا چکے

ہوتی ہے تن میں روح پیامِ اجل سے شاد / دن وعدۂ وصال کے نزدیک آ چکے

پیمانہ میری عمر کا لبریز ہو کہیں / ساقی مجھے بھی اب تو پیالہ پلا چکے

دیوانہ جانتے ہیں ترا ہوشیار انھیں / جامہ کو جسم کے بھی جو پرزے اُڑا چکے

بے وجہ ہر دم آئینہ پیشِ نظر نہیں / سمجھے ہم آپ آنکھوں میں اپنی سما چکے

اس دلربا سے وصل ہوا دے کے جان کو / یوسف کو مول لے چکے قیمت چکا چکے

اُٹھا نقاب چہرۂ زیبائے یار سے / دیوار درمیاں جو تھی ہم اُس کو ڈھا چکے

زیرِ زمیں بھی تڑپیں گے لے آسمانِ حسن / بیتاب تیرے گور میں بھی تاب لا چکے

آرائشِ جمال بلا کا نزول ہے / اندھیر کر دیا جو وہ مِسّی لگا چکے

دو ابرو اور وہ لبِ جاں بخش یار کے / زندوں کو قتل کر چکے مُردے جلا چکے

مجبور کر دیا ہے محبت نے یار کی / باہر ہم اختیار سے ہیں اپنے جا چکے

صدموں نے عشق و حسن کے دم کر دیا فنا
آتشؔ سزا گناہ محبت کی پا چکے

یہ آرزو تھی تجھے گُل کے روبرو کرتے / ہم اور بلبلِ بیتاب گفتگو کرتے

پیامبر نہ میسّر ہوا تو خوب ہوا / زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ / کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

ہمیشہ رنگ زمانہ بدلتا رہتا ہے / سفید رنگ ہیں آخر سیاہ مو کرتے

لٹاتے دولتِ دنیا کو میکدے میں ہم
طلائی ساغرِ مے نقرئی سبو کرتے

ہمیشہ میں نے گریباں کو چاک چاک کیا
تمام عمر رفوگر رہے رفو کرتے

جو دیکھتے تری زنجیرِ زلف کا عالم
اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

بیاضِ گردنِ جاناں کو صبح کہتے جو ہم
ستارۂ سحری تکمۂ گلو کرتے

یہ کعبہ سے نہیں بے وجہ نسبتِ رُخِ یار
یہ بے سبب نہیں مُردے کو قبلہ رو کرتے

سکھاتے نالۂ شبگیر کو در اندازی
غمِ فراق کا اس چرخ کو عدو کرتے

وہ جانِ جاں نہیں آتا تو موت ہی آتی
دل و جگر کو کہاں تک بھلا لہو کرتے

نہ پوچھ عالمِ برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

وحشت آگیں ہے فسانہ مری رسوائی کا
عاشقِ زار ہوں اک آہوئے صحرائی کا

پاؤں زنداں سے نہ نکلا ترے سودائی کا
داغ دل ہی میں رہا لالۂ صحرائی کا

دھیان رہتا ہے قدِ یار کی رعنائی کا
سامنا روز ہے یاں آفتِ بالائی کا

کوہِ غم مثلِ پرِ کاہ اُٹھا لیتا ہوں
ناتوانی میں بھی عالم ہے توانائی کا

لحدِ تیرہ میں مجھ پر جو لگا ہونے عذاب
پھر گیا آنکھوں میں عالم شبِ تنہائی کا

کونسا دل ہے نہیں جس میں خدا کی منزل
شکوہ کس مُنہ سے کروں میں بتِ رعنائی کا

مردِ درویش ہوں تکیہ ہے توکل میرا
خرچ ہر روز ہے یاں آمدِ بالائی کا

بوسۂ چشمِ غزالاں مجھے یاد آتے ہیں
نہیں بھولا میں مزہ میوۂ صحرائی کا

زندگانی نے مجھے مُردہ بنا رکھا ہے
ملک الموت سے سائل ہوں مسیحائی کا

مصرعِ سرو میں لاکھوں ہی نکالوں شاخیں
باندھوں مضموں جو قدِ یار کی رعنائی کا

جب سے شیطاں کا احوال سُنا ہے میں نے
پائے بُت پر بھی ارادہ ہے جبیں سائی کا

ہوئی حجت مجھے غنچے کے چٹکنے کی صدا
شک پڑا تھا دہنِ یار میں گویائی کا

وہ تماشا ہے ترا حسن پر آشوب اے ترک
آنکھوں کی راہ سے دم نکلے تماشائی کا

کس طرح سے دلِ وحشی کا میں کہنا مانوں
کوئی قائل نہیں دیوانے کی دانائی کا

یہی زنجیر کے نالے سے صدا آتی ہے
قید خانے میں بُرا حال ہے سودائی کا

اک پری کو بھی نہ شیشے میں اُتارا میں نے
یاد کیا آئے گا اس گنبدِ مینائی کا

بعد شاعر کے ہو مشہور کلامِ شاعر
شہرہ البتہ کہ ہو مردہ کی گویائی کا

شہر میں قافیہ پیمائی بہت کی آتش
اب ارادہ ہے مرا بادیہ پیمائی کا

حُسنِ پری اِک جلوۂ مستانہ ہے اُس کا
ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اُس کا

وہ شوخ نہاں گنج کے مانند ہے اُس میں
معمورۂ عالم ہے جو ویرانہ ہے اُس کا

جو چشم کہ حیراں ہوئی آئینہ ہے اُس کی
جو سینہ کہ صد چاک ہوا شانہ ہے اُس کا

دل قصرِ شہنشہ ہے وہ شوخ اُس میں شہنشاہ
عرصہ یہ دو عالم کا جلوخانہ ہے اُس کا

وہ یاد ہے اُس کی کہ بُھلا دے دو جہاں کو
حالت کو کرے غیر وہ یارانہ ہے اُس کا

یوسف نہیں جو ہاتھ لگے چند درم سے
قیمت جو دو عالم کی ہے بیعانہ ہے اُس کا

آوارگیٔ نکہتِ گل ہے یہ اشارہ
جامہ سے وہ باہر ہے جو دیوانہ ہے اُس کا

یہ حال ہوا اس کے فقیروں سے ہویدا
آلودۂ دنیا جو ہے بیگانہ ہے اُس کا

شکرانۂ ساقیٔ ازل کرتا ہے آتش
لبریز مئے شوق سے پیمانہ ہے اُس کا

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا؟
کہتی ہے تجھکو خلقِ خدا غائبانہ کیا؟

زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف
قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا؟

اُڑتا ہے شوقِ راحتِ منزل سے اسپِ عمر
مہمیز کس کو کہتے ہیں اور تازیانہ کیا؟

چاروں طرف ہے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر
دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا؟

صیاد اسیر دام رگِ گل ہے عندلیب دکھلا رہا ہے چھپ کے اُسے دام و دانہ کیا؟
طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا؟
آتی ہے کس طرح سے مری قبض روح کو دیکھوں تو موت ڈھونڈ رہی ہے بہانہ کیا؟
ہوتا ہے زرد سن کے جو نامرد مدعی رستم کی داستاں ہے ہمارا فسانہ کیا؟
صیاد گل عذار دکھاتا ہے سیر باغ بلبل قفس میں یاد کرے آشیانہ کیا؟

یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

کام ہمت سے جواں مرد اگر لیتا ہے سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے
ناگوارا کو جو کرتا ہے گوارا انساں زہر کھا کر مزۂ شیر و شکر لیتا ہے
منزل فقر و فنا جائے ادب ہے غافل بادشہ تخت سے یاں اپنے اتر لیتا ہے
عقل کو دیتی ہے انساں کی جہالت اُمل موت سے جان چھپانے کو سپر لیتا ہے

غیرت نالہ و فریاد نہ کھو اے آتش
آشنا کوئی نہیں کون خبر لیتا ہے

یہ کس رشک مسیحا کا مکاں ہے زمیں یاں کی چہارم آسماں ہے
خدا پنہاں ہے عالم آشکارا نہاں ہے گنج ویرانہ عیاں ہے
دل روشن ہے روشن گر کی منزل یہ آئینہ سکندر کا مکاں ہے
تکلف سے بری ہے حسن ذاتی قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے
بہ رنگ بو ہوں گلشن میں میں بلبل بغل غنچے کی میرا آشیاں ہے
شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ قناعت بھی بہار بے خزاں ہے
بہت آتا ہے یاد اے صبر مسکیں خدا خوش رکھے تجکو تو جہاں ہے
تعلق ہوتا ہے خوشبو سے اس کی کسی گل رو کا غنچہ عطر داں ہے

وطن میں اپنے اہل شوق کی طرح
سفر میں روز و شب ریگ رواں ہے

سحر ہو وے کہیں شبنم کرے کوچ
گل و بلبل کے در یادہ میاں ہے

سعادت مند قسمت پر ہیں شاکر
ہما کو مغز بادام استخواں ہے

جرس کے ساتھ دل رہتے ہیں نالاں
مرے یوسف کا عاشق کارواں ہے

قد محبوب کو شاعر کہیں سرو
قیامت کا یہ اے آتش نشاں ہے

بازار دہر میں تری منزل کہاں نہ تھی؟
یوسف نہ جس میں ہو کوئی ایسی دکاں نہ تھی

منزل ہی دور ہے جو یہ پہنچی نہیں ہنوز
دم لینے والی راہ میں عمر رواں نہ تھی

دکھلائے سیر آنکھوں کو بام مراد کی
ایسی کوئی کمند کوئی نردباں نہ تھی

رہ جانا پیچھے جسم کا جاں سے عجب نہیں
کس کارواں کی گرد پس کارواں نہ تھی

نافہمی کی دلیل ہے یہ سجدہ سے ابا
ابلیس کو حقیقت آدم عیاں نہ تھی

افسوس کیا جوانی رفتہ کا کیجیے
وہ کون سی بہار تھی جس کو خزاں نہ تھی

نالوں سے ایک دن نہ کیے گرم گوش یار
آتش مگر تمہارے دہن میں زباں نہ تھی

سوالات

۱۔ لکھنؤ اسکول سے کیا مراد ہے، اس کی ابتدا کب ہوئی؟ اسکے خاص خاص رکن کون تھے؟

۲۔ لکھنؤ اور دہلی اسکول کا مقابلہ کیجیے۔

۳۔ "آتش نے صوفیانہ شاعری کے حسن کو دوبالا کر دیا" کیا یہ صحیح ہے؟

حکیم مومن خاں مومنؔ دہلوی

ولادت دہلی ۱۲۱۵ھ
وفات دہلی ۱۲۶۸ھ

مومن خاں نام۔ مومنؔ تخلص۔ والد کا نام حکیم غلام نبی خاں شرفائے دہلی سے تھے۔ اور بڑی عزت رکھتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے ان کے پیدا ہونے کے وقت کان میں اذان دی۔ اور اُنھیں نے مومن خاں نام رکھا۔ شاہ عبدالقادر صاحب سے عربی کتابیں پڑھیں۔ پھر فن طب جو آبائی پیشہ تھا۔ اُس کی طرف توجہ کی۔ اور کمال حاصل کیا۔ علم نجوم میں ان کو ایسا ملکہ تھا کہ دُور دُور تک ان کا مدِّ مقابل نہ تھا۔ شروع میں عشق مجازی کی طرف طبیعت مائل ہوئی۔ تمام دیوان ان کا عاشقانہ مضامین سے بھرا ہوا ہے۔ پھر نوجوانی ہی میں طبیعت نے پلٹا کھایا۔ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کے مرشد مولانا سیّد احمد صاحب بریلوی کے مرید ہوئے اور اخیر اخیر برگزیدگی میں شہرۂ آفاق ہوئے۔

ان کا حافظہ بہت قوی تھا۔ شعر پڑھنے کا انداز نرالا رکھتے تھے۔ کسی امیر کی دربارداری کبھی نہ کی اور نہ کسی امیر کی مدح میں قصیدہ لکھا۔ صرف ایک مرتبہ رئیس پٹیالہ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا وہ بھی مدحیہ نہیں شکریئے کے طور پر ہے۔ یعنی ایک ہتھنی بلا طلب ان کے نذر کی۔ ان کی غیور طبیعت تھی۔ اس کا صلہ سخن میں دیا۔ دِلّی ان کا مسکن و مولد تھا۔ ایک مرتبہ راجہ کپورتھلہ نے تین سو روپیہ مہینے پر اُنھیں بُلایا تھا لیکن اس خیال سے کہ یہی تنخواہ اُن کے دربار میں ایک گویّے کی بھی تھی نہ گئے۔ ۱۲۶۸ھ میں

وفات پائی، ظاہری سبب موت کو ٹھے سے گرنا ہوا جس کا بحساب نجوم اُنھوں نے حکم لگایا تھا کہ پانچ دن یا پانچ مہینے یا پانچ برس میں مرجاؤں گا۔ چنانچہ پانچ ماہ بعد مر گئے۔ کوٹھے سے گرنے کی خود یہ تاریخ لکھی ہے

دست و بازو بشکست
۱۲۶۸ھ

اِن کے کلیات میں غزلوں کے سوا دو چار قصیدے اور چند مثنویاں اور دو ایک واسوخت بھی ہیں۔ اِن کا کلام عشقیہ مضامین کے سوز وگداز کا مخزن ہے جس میں درد اور اثر کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے مقطع میں اپنے تخلص کی مناسبت سے اکثر ایسے مضامین لکھے ہیں جو بہت دلچسپ اور موزوں ہوتے ہیں۔ مثلاً

عمر ساری تو کٹی عشقِ بُتاں میں مومن　　آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

فارسی کی قابلیت مسلّم تھی اور اس زبان میں بھی اِن کا دیوان موجود ہے۔

اثر اُس کو ذرا نہیں ہوتا　　رنج راحت فزا نہیں ہوتا
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوے　　ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں　　سو تمھارے سوا نہیں ہوتا
حالِ دل یار کو لکھوں کیونکر　　ہاتھ دل سے جُدا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کیوں سنے عرضِ مضطرب مومن
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
مُنہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم

صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا
لو بندگی! کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

کیا گُل کھلے گا دیکھیے ہے فصلِ گُل تو دُور
اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

کیا دل کو لے گیا کوئی بیگانہ آشنا
کیوں اپنے جی سے لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

لے نام آرزو کا تو دل سے نکال لیں
مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

تاثیرِ صبر میں نہ اثر اضطراب میں
بے چارگی سے جان پڑی کس عذاب میں

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

بے نالہ مُنہ سے جھڑتے ہیں بے گریہ آنکھ سے
اجزائے دل کا حال نہ پوچھ اضطراب میں

رہتے ہیں جمع کوچۂ جاناں میں خاص و عام
آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں

مطلب کی جستجو نے یہ کیا حال کر دیا
حسرت بھی اب نہیں دلِ ناکامیاب میں

ناکامیوں سے کام رہا عمر بھر ہمیں
پیری میں یاس ہے جو ہوس تھی شباب میں

پیہم سجود پائے صنم پر دمِ وداع
مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ یاد نہ ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیشتر وہ کرم تھا میرے جو حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تمھارے جی کو بری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ[1] گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
وہی میں ہوں مومن مبتلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو — عذر کچھ چاہیے ستانے کو
صبح عشرت ہے وہ شام وصال — ہائے کیا ہو گیا زمانے کو
برق کا آسماں پر ہے دماغ — پھونک کر میرے آشیانے کو
کوئی دن ہم جہاں میں بیٹھے ہیں — آسماں کے ستم اٹھانے کو
چل کے کعبے میں سجدہ کر مومن
چھوڑ اس بت کے آستانے کو

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہوں گے
فلس[2] ماہی کے گل شمع شبستاں ہوں گے

---

[1] اب سے پہلے مومن و ذوق تک واحد و جمع کی ضمیریں ایک شعر میں کہہ دی جاتی تھیں۔ یعنی ایک مصرع میں آپ یا تم اور دوسرے میں ضمیر واحد حاضر (تو) کہہ دی۔ جیسے اس شعر میں کہ پہلے مصرع میں آپ اور دوسرے میں تم ہے۔ یہ عمل اب متروک ہے اور اس عیب کو شتر گربہ کہتے ہیں اب اگر پہلے مصرع میں آپ کہیں گے تو دوسرے میں بھی اسی طرح کہیں گے۔ کہ آپ کو یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔

[2] فلس ماہی مچھلی کی کھال پر جو نقش ہوتے ہیں اس نقش کو کہتے ہیں۔

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خواب عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے
ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیماں کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہوں گے
منتِ حضرتِ عیسیٰ نہ اُٹھائیں گے کبھی
زندگی کے لیے شرمندۂ احساں ہوں گے
پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی
پھر وہی پاؤں وہی خارِ مغیلاں ہوں گے
سنگ اور ہاتھ وہی وہ ہی سر و داغِ جنوں
وہی ہم ہوں گے وہی دشت بیاباں ہوں گے
عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

یہ حالت ہے تو کیا حاصل بیاں سے　　کہوں کچھ اور کچھ نکلے زباں سے
بُرا ہے عشق کا انجام یا رب　　بچانا فتنۂ آخر زماں سے
وہ کرتے ہیں پشیماں لاش پر اب　　تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے
نہ بولوں گا نہ بولوں گا کہ میں ہوں　　زیادہ بدگماں اُس بدگماں سے
خدا کی بے نیازی ہائے مومن
ہم ایماں لائے تھے نازِ بتاں سے

اُلٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ
بے طاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ

بہرِ عیادت آئے وہ لیکن قضا کے ساتھ
دم ہی نکل گیا مرا آوازِ پا کے ساتھ

آتی ہے بوئے داغِ شبِ تارِ ہجر میں
سینہ بھی چاک ہو نہ گیا ہو قبا کے ساتھ

بے پردہ غیر پاس اسے بیٹھا نہ دیکھتے
اُٹھ جاتے کاش ہم بھی جہاں سے حیا کے ساتھ

گلبانگ کس کا مشورۂ قتل ہو گیا
کچھ آج بوئے خوں ہے وہاں کی ہوا کے ساتھ

اللہ ری گمرہی بُت و بُت خانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبے کو اک پارسا کے ساتھ

سوالات

۱۔ مومن اور غالب کے رشک میں کیا فرق ہے مثالیں دے کر واضح کیجیے؟

۲۔ مومن کے خصائص امتیازی کیا ہیں؟

۳۔ مومن کا کلام کیوں مشکل سمجھا جاتا ہے؟

۴۔ "مومن کے یہاں صحیح تغزل موجود ہے" واضح کیجیے۔

مزید مطالعہ کے لیے

(۱) نگار۔ مومن نمبر۔

(۲) مومن۔ رسالہ اُردو۔ خواجہ احمد فاروقی۔

مرزا اسد اللہ غالب

نوٹ : مرزا غالب کے حالات اُن کے انتخاب عودِ ہندی میں دیکھنا چاہئیں۔

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوے قاتل نہیں رہا

بر روے شش جہت[۱] درِ آئینہ باز ہے
یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں
حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد

شمع بجھتی ہے تو اُس میں سے دُھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی
اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

درخورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا
نگہِ ناز ہے سُرمے سے خفا میرے بعد

ہے جنوں اہلِ جنوں کے لیے آغوشِ وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جُدا میرے بعد

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

۱؎ شش جہت مراد دنیا ۱۲۔

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی — کہ کرے تعزیت[1] مہر و وفا میرے بعد

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر — جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے — سرگرمِ نالہ ہائے شرربار دیکھ کر

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا — رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

آتا ہے میرے قتل کو پُرجوشِ رشک سے — مرتا ہوں اُس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق — لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ — ہم کو حریصِ لذّتِ آزار دیکھ کر

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ — لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

زنّار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال — رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں — جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے — طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر — دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں — مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں — ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار — اے کاش جانتا نہ تری رہگزر کو میں

ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے — کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں

---

[1] ماتم پرسی ۱۲

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے — یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک تیز رَو کے ساتھ — پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار — کیا پوجتا ہوں اُس بُتِ بیداد گر کو میں

پھر بیخودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار — جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا — سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہنر کو میں

غالب خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

دیوانگی سے دوش پہ زُنّار بھی نہیں — یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے — دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے — دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں — طاقت بقدرِ لذتِ دیدار بھی نہیں

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش — صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

گنجائشِ عداوتِ اغیار اک طرف — یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

ڈر نالہ ہائے زار سے میرے خدا کو مان — آخر نوائے مُرغِ گرفتار بھی نہیں

دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی — حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا — لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہُشیار بھی نہیں

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو

نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر مُنھ میں زباں کیوں ہو

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمہی تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

غلط ہے جذب دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے تمھیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوفِ بد آموزیٔ عدو کیا ہے

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

سوالات

۱۔ غالب کا مرتبہ اُردو شاعری میں کیا ہے؟

۲۔ "غالب خلقی شاعر ہے" بحث کیجیے۔

۳۔ "غالب اُردو ادب پر احسانات کے لحاظ سے انیس و سودا کی صف میں جگہ پاتا ہے۔" بحث کیجیے۔

۴۔ غالب کی مقبولیت کے اسباب کیا ہیں؟

نواب مرزا خاں داغؔ دہلوی

آپ کا نام نواب میرزا خاں اور داغؔ تخلص تھا۔ دہلی کے قدیم باشندے تھے۔ سنہ ۱۲۴۶ھ مطابق سنہ ۱۸۳۱ء روز چہارشنبہ مقام دہلی محلہ بلی ماران میں پیدا ہوئے۔ اور قریب قریب سات برس کی عمر سے آپ کی تعلیم و تربیت کا دور شروع ہوا۔ اور پہلے مولوی غیاث الدین مولف غیاث اللغات سے کچھ زبان فارسی کی درسی کتابیں پڑھیں۔ اور پھر سنہ ۱۸۴۴ء کو آپ قلعۂ دہلی میں باریاب ہوئے یہاں مولوی سید احمد حسین ولد میر غلام حسین شکیبا تلمیذ میر تقی میرؔ سے عربی فارسی کی تکمیل کی۔ خوشنویسی میں سید امیر پنجہ کش اور اُن کے شاگرد رشید مرزا عباد اللہ بیگ سے مشق بہم پہنچائی۔ اور قلعہ ہی کے زمانۂ قیام میں فنون سپاہ گری اور فنون شہسواری کے تمام رموز مختلف اُستادوں سے سیکھ کر یگانۂ روزگار ہوگئے۔

اُس زمانے میں قلعہ میں شاعری کا بڑا چرچا تھا۔ غالبؔ، ذوقؔ، صہبائیؔ، آزردہؔ وغیرہ اساتذہ فن جمع ہوتے اور حضور سلطانی میں داد سخن دیتے تھے۔ اسی صحبت میں دیکھا دیکھی آپ کو شاعری کا مذاق پیدا ہوا۔ اُستاذ ذوقؔ کے شاگرد ہوگئے اور مشاعروں میں شریک ہوکر ان اساتذہ سے فیض حاصل کرتے رہے۔ سنہ ۱۸۵۷ء میں غدر کے ہنگامے نے دلی کو زیروزبر کر دیا۔ تو پورے ۲۴ برس بعد آپ کو بھی عیش گزشتہ کو خیرباد کہنا پڑا اور اس کشاکش وانقلاب میں رام پور چلے آئے۔ نواب یوسف علی خاں کا زمانہ تھا۔ اُن کی مہمان نوازی اور قدردانی نے

اُن کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور اُن کے بعد نواب کلب علی خاں مرحوم نے بھی اُسی وضع کو نباہا۔ بلکہ اُن کے استقلال کی یہ صورت نکال دی کہ اصطبل۔ گاڑی خانے۔ فراش خانے۔ کنول خانے۔ شتر خانے کی خدمات بھی سپرد کر دیں۔ اور مصاحب بھی بنائے رکھا۔ ۲۴ برس تک آپ نے ان خدمات کو حُسن وخوبی سے انجام دیا۔ نواب یوسف علیخاں مرحوم کے زمانے سے رام پور میں شاعری کی گرم بازاری تھی۔ اور اس زمانے میں تو دلّی اور لکھنؤ کے تمام باکمال کھنچ کھنچ کر یہیں آ گئے تھے۔ شب و روز سخن پردازی کا بازار گرم تھا۔ مشاعروں پر مشاعرے ہوتے تھے اور مستند کاملینِ فن اُن میں شرکت کرتے تھے۔ مگر "قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است" والا مضمون تھا۔ داغ مرحوم کی غزلیں خواص و عوام سب کی زبان پر ہوتیں۔ اور دوسرے لوگ اُن کو دیکھ کر رہ جاتے تھے۔ یہ خاص انداز سے مشاعرے میں غزل پڑھتے اور سب پر چھا جاتے۔ اسی طرح ریاست رام پور میں مدتوں آپ کا قیام رہا۔ اسی دوران میں دلّی، کلکتے، پٹنے کے کئی سفر بھی کیے۔ اور حج کعبہ سے بھی مشرف ہوئے۔ ۱۸۸۶ء میں کونسل کا تقرر ہوا۔ اور جنرل عظیم الدین خاں سے ان کی نہ بنی تو ریاست رام پور سے قطع تعلق کر کے دہلی چلے گئے۔ اور مختلف شہروں میں اپنے دوستوں قدر دانوں اور شاگردوں کے یہاں پھرتے رہے۔

۱۳۰۵ھ میں آپ حیدر آباد تشریف لے گئے تو آپ کی کافی شہرت ہو گئی۔ اور رفتہ رفتہ آپ کی پہلی عرضی راجہ گردھاری پرشاد بہادر عرف بنسی راجہ المتخلص بہ باقی کے ذریعے سے حضور میر محبوب علی خاں بہادر

نظام دکن تک پہنچ گئی۔ مگر اس مرتبہ آپ دہلی واپس آگئے۔ مگر چند ہی روز میں نواب آسمان جاہ نے شقے کے ذریعے سے آپ کو حیدرآباد بلایا۔ اور آپ فوراً تشریف لے گئے۔ آپ مولوی ظہور علی صاحب کے مکان پر مقیم تھے کہ ۲۶ جمادی الثانی ۱۳۰۸ھ روز شنبہ ۹ بجے شب حضور جنت نشان آصف جاہ سادس نے اپنی غزل سربمہر لفافے میں بھیجی جس کو چند چوب دار لے جاکر حاضر ہوئے اور صبح حاضر دربار ہونے کا حکم سنایا جب حاضر دربار ہوئے تو آپ نے یہ تاریخ کہی سے

حضوری کی تاریخ پوچھیں اگر   تو کہہ دو کہ لے داغ سلطان سے

اس کے نو مہینے بعد ایک مراسلہ معتمد محکمۂ خاص کا صادر ہوا کہ سرکار نے آپ کے نام چار سو پچاس روپیہ حالی کا وظیفہ یوم ورود سے جاری فرمایا۔ ۹ ربیع الاول ۱۳۱۲ھ کو بحکم سلطانی اس وظیفہ میں اضافہ کرکے ایک ہزار ماہوار کر دیا گیا۔ اور وقتاً فوقتاً عطیات شاہی سے بھی بہرہ یاب ہوتے رہے۔ اس کے بعد ایک موضع جس کی آمدنی تقریب دو ہزار سالانہ تھی آپ کو دیا گیا اور آپ اٹھارہ برس تک عیش و عشرت میں بسر کرتے رہے اور آخر ۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۷ فروری ۱۹۰۵ء کو مرض فالج میں مبتلا ہو کر انتقال فرمایا۔ اور حیدرآباد ہی میں مدفون ہوئے اور بے تعداد شاگرد اطراف ہند میں چھوڑے۔

مرزا داغ نہایت وارستہ مزاج، آزاد خیال، مرنج مرنجان، نیک طینت خوش وضع انسان تھے۔ دوست دشمن سب سے یکساں برتاؤ کرتے تھے۔ لوگوں کے اعتراض، حاسدوں کے حسد کا جواب اُن کے پاس سوائے خاموشی کے کچھ نہ تھا۔ خود بھی اسی پر عمل تھا۔

اور شاگردوں کو بھی یہی نصیحت کرتے تھے۔

آپ کے نتائج افکار سے تین دیوان یادگار ہیں گلزارِ داغ، آفتابِ داغ، مہتابِ داغ۔ ایک مثنوی یادگارِ داغ بھی ہے جو صفائی زبان کے لحاظ سے بے مثل ہے۔

قصیدہ، رباعی، مثنوی، غزل سب اصنافِ سخن پر آپ قادر تھے۔ مگر آپ کی غزل میں جو صفائی، روانی، روزمرہ کی خوبیاں، زبان کا لوچ ہے وہ اُن کے کسی معاصر کے یہاں نہیں ہے۔

چند غزلیں یہاں درج کی جاتی ہیں :-

ذکر میرا اگر آجاتا ہے — سُن کے وہ صاف اُڑا جاتا ہے
غم ترا حصہ ہے میرا لیکن — دل جُر اکر اسے کھا جاتا ہے
تھک گیا درد بھی اُٹھتے اُٹھتے — اب کلیجے میں رہا جاتا ہے
کیا نزاکت ہے کہ آئینے میں — عکس کے ساتھ کھنچا جاتا ہے
ناز سے کھینچ نہ مجھ پہ تلوار — غیر مشتاق ہوا جاتا ہے
ایک ہے تیری نگہ میری آہ — کہیں ایسوں سے رہا جاتا ہے
حسرتیں دل کی مٹی جاتی ہیں — قافلہ ہے کہ لٹا جاتا ہے
راہ میں گر نہ پڑے خط یارب — نامہ بر مثلِ ہوا جاتا ہے

داغ کو دیکھ کے بولے یہ شخص
آپ ہی آپ جلا جاتا ہے

اُس بزم میں شریک تو جایا نہ جائے گا — میں جاؤں گا مگر مرا سایا نہ جائے گا
دل دے کے اُن کی بزم میں جایا نہ جائے گا — یہ مدعی بغل میں چھپایا نہ جائے گا
اے حشر اتنا ناز کہ ہم ہیں شہیدِ ناز — مُردوں کی طرح ہم کو اُٹھایا نہ جائے گا

دل گیا ملاؤ گے کہیں ہو گیا یقیں
تم سے تو خاک میں بھی ملا یا نہ جائے گا

جو دل دکھا رہا ہے مزہ ہر گھڑی مجھے
آنکھوں سے سو برس بھی دکھا یا نہ جائے گا

دشمن کے آگے سر نہ جھکے گا کسی طرح
یہ آسماں زمیں سے ملا یا نہ جائے گا

فتنہ نہیں ہوں جس کو اُٹھا یا کرے فلک
مجھ سے گرے ہوئے کو اُٹھا یا نہ جائے گا

زلفیں نہیں کہ شانے سے آراستہ کیا
بگڑا ہوا مزاج بنا یا نہ جائے گا

اے داغ تجھ کو رزق کی خواہش ہے چرخ سے
اتنا یہ غم کھلائے گا کھا یا نہ جائے گا

جلوہ دیکھا تری رعنائی کا
کیا کلیجہ ہے تماشائی کا

رہ گیا عرش سے آگے جا کر
ہائے عالم مری تنہائی کا

یوں نہ ہو برق تجلی بیتاب
مل گیا رنگ تماشائی کا

یاد آتا ہے وہ رسوا کر کے
رنج کرنا مری رسوائی کا

آئی شوخی میں کہاں سے تمکیں
پڑ گیا صبر تمنائی کا

اے لبِ یار جلا دے دل کو
واسطہ اپنی مسیحائی کا

روزِ دیدار خدا خیر کرے
معرکہ ہے تری زیبائی کا

اب تصوّر سے بھی گھبراتا ہوں
کیا مزہ ہے مجھے تنہائی کا

مُنہ سے بولے تو کہا آئینہ
کھیل کھیلے تو خود آرائی کا

ضعف نے دل کو تڑپنے نہ دیا
ہو گیا نام شکیبائی کا

اُن کی شہرت بھی مٹی جاتی ہے
کیا ٹھکانا مری رسوائی کا

کیا تصوّر بھی نہ آنے دے گی
مُنہ تو دیکھوں شبِ تنہائی کا

داغ کی قبر مٹا کر بولے
یہ نشاں تھا اُسی سودائی کا

تم کو کیا ہر کسی سے ملنا تھا | دل ملا کر مجھی سے ملنا تھا
پوچھتے کیا ہو کیوں لگائی دیر | اک نئے آدمی سے ملنا تھا
مل کے غیروں سے بزم میں یہ کہا | مجھ کو آکر سبھی سے ملنا تھا
کیوں بہانے کیے شبِ وعدہ | صاف کہدو کسی سے ملنا تھا
عید کو بھی خفا خفا ہی رہے | آج کے دن خوشی سے ملنا تھا
آپ کا مجھ سے جی نہیں ملتا | اس محبت کے جی سے ملنا تھا

تم تو اُکھڑے رہے ہمیں اے داغ
ہر طرح مدعی سے ملنا تھا

اے فلک مورد عتاب ہوں میں | وصل سے خاک کامیاب ہوں میں
تم میں یہ وصف ہے کہ ہو بے داغ | مجھ میں یہ عیب بے حجاب ہوں میں
دے کے خط کون انتظار کرے | اپنے قاصد کے ہمرکاب ہوں میں
جب ملا رہنما تو یہ جانا | رہروِ راہِ ناصواب ہوں میں
کیوں کسی زلف کی بلا میں پھنسوں | کیوں گرفتار پیچ و تاب ہوں میں
کیوں کسی چشم مست کو دیکھوں | مفت آلودۂ شراب ہوں میں

داغ کیا خوف صرصر عصیاں
خاک پائے ابو تراب ہوں میں

سوالات

۱۔ داغ کا مقابلہ اُن کے ہم عصر شعراء سے کیجیے۔
۲۔ کلام داغ کی خصوصیات تحریر کیجیے۔
۳۔ "داغ کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت اُن کی زبان ہے" بحث کیجیے۔
۴۔ داغ کی شاعری میں اس زمانہ کی زندگی کہاں تک جلوہ گر ہے؟

مزید مطالعہ کے لیے

(۱) کمال داغ۔ بہار داغ۔ منتخب داغ۔

منشی امیر احمد امیرؔ مینائی لکھنوی

ولادت ۱۲۴۴ھ وفات ۱۳۱۸ھ ۱۹۰۰ء

امیر احمد نام امیرؔ تخلص. خلف اکبر مولوی کرم محمد نسبی سلسلہ حضرت شاہ مینا ؒ سے ملتا ہے. جن کا مزار لکھنؤ میں زیارت گاہ انام ہے. یہی وجہ ہے کہ ان کے نام کے ساتھ مینائی لکھا جاتا ہے. اُن کو صرف خاندانی فضیلت ہی حاصل نہ تھی بلکہ اپنی ذات سے خود بھی صاحب زہد و تقویٰ صوفی مشرب. منکسر المزاج بزرگ تھے. ابتدائی زمانہ تحصیل علوم و فنون میں بسر ہوا. فہم سلیم اور ذہانت فطری کی امداد سے عربی و فارسی میں خاصی دستگاہ رکھتے تھے. شعر و شاعری کی طرف طبیعت مائل ہوئی. تو اِس فن میں بھی خاص کمال حاصل کیا. اِن کی ہمہ دانی مسلم ہے. اس فن میں آپ کو سید مظفر علی اسیرؔ سے تلمذ تھا. غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے واجد علی شاہ (اودھ) کے دربار میں رسائی ہوئی. اور مختلف خدمات پر مامور رہے. لکھنؤ کی تباہی کے بعد نواب یوسف علی خاں والی رام پور نے آپ کی قدر دانی فرمائی اور اپنی ریاست میں عدالت دیوانی کا رُکن بنایا. اِسی عہدے کے سبب سے آپ مُفتی کہے جاتے تھے. نواب ممدوح کے بعد خُلد آشیاں نواب کلب علی خاں والی رام پور کے عہد میں آفتاب اقبال و کمال نے خاص عروج پایا. یہاں تک کہ نواب صاحب کی اُستادی کا فخر بھی منشی صاحب کو حاصل ہوا. یہ وہ زمانہ ہے کہ داغؔ. اسیرؔ. حیاؔ. منیرؔ. بحرؔ. رَسا. ذکیؔ. قلقؔ. عروجؔ. جلالؔ. تسلیمؔ وغیرہ کا رام پور کے دربار میں جمگھٹا تھا. اور اپنی وجاہت

اور لیاقت۔ اور عزّت کی بدولت منشی صاحب ان سب شعرا کے صدر اعظم بنے ہوئے تھے۔

ایشیائی شعرا کے دورِ آخر کا جس کو ابھی پچاس سال بھی نہیں گزرے۔ امیر۔ داغ۔ جلال خاتمہ کر گئے۔ منشی صاحب کے ۲ دو دیوان اُردو کے اب تک شایع ہو چکے ہیں۔ پہلا مرأۃ الغیب جس میں اکثر ابتدائی غزلیں ہیں۔ دوسرا صنم خانۂ عشق جس میں رام پور کے زمانے کا کلام ہے۔ غالباً تیسرا دیوان اور ہے جو غیر مطبوع ہے۔ اس کے سوا ایک نعتیہ دیوان اور چند مثنویاں اور واسوخت بھی ہیں۔ فارسی دیوان بھی مرتّب و مکمل ہے۔ مگر وہ بھی چھپا نہیں ہے۔ آپ کے مجموعۂ سخن میں غزل، قصیدہ، رباعی، مسدس، مخمّس غرض کہ ہر قسم کا کلام موجود ہے۔ اور سب سے آپ کی اُستادی کی شان نمایاں ہے۔ علاوہ دواوین نظم کے آپ نے ایک تذکرہ شعراے رام پور بھی جمع کیا تھا جس کا نام انتخاب یادگار ہے۔ اور چھپ گیا ہے۔ آخر میں آپ نے اُردو زبان کے لُغت کی ترتیب شروع کی تھی جس کا نام امیر اللغات ہے۔ اور جس کی ۲ دو جلدیں شایع ہو چکی ہیں جن میں صرف الف مقصورہ و ممدودہ کے الفاظ ہیں۔ باقی جلدیں غیر مطبوع و غیر مرتّب ہیں۔ اِس لُغت کی تکمیل کے خیال سے آپ کو سیاحت حیدر آباد دکن کا شوق دامنگیر ہوا مگر افسوس کہ حیدر آباد پہنچ کر یہ حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ وہاں پہنچتے ہی ایسے علیل ہوئے کہ پھر نہ سنبھلے۔ اور روز بروز حالت بگڑتی چلی گئی۔ کم و بیش ایک مہینے کی علالت کے بعد جمادی الآخر ۱۳۰۸؁ھ مطابق اکتوبر ۱۹۰۰؁ء راہی عالم باقی ہوئے۔ اور وہیں پیوند زمین ہوئے۔ ہندوستان میں آپ کے سیکڑوں شاگرد ہیں اور آپ کی

شہرت اور نام آوری مثل آفتاب کے روشن ہے۔

یہ آفتاب ہے گرم اس کی کبریائی کا — کہ ذرّہ ذرّہ ہے آئینہ خود نمائی کا
پکارتا ہے یہ انداز و ناز توبہ شکن — کہ آئے وہ جسے دعویٰ ہو پارسائی کا
حیا تو یہ کہ ہے ستر ہزار پردوں میں — مگر ہے شوق اُسے عالم آشنائی کا
طریقِ عشق میں گُم ہو کے پہنچے منزل پر — نیا یہ راستہ سوجھا ہمیں رسائی کا
خدا خدا جو کرے اور خودی کا دم بھی بھرے — بڑا فریبی ہے جھوٹا ہے وہ خدائی کا
جو بندہ ہے تو مزا بندگی میں پیدا کر — نہیں وہ بندہ جسے ذوق ہو رہائی کا

بشر سے حمد الٰہی امیرؔ کیا ممکن
پہاڑ اُٹھائے کہاں حوصلہ یہ رائی کا

آنکھوں میں نور تیرا دل میں سرور تیرا — دروازے سے ہے گھر تک سارا ظہور تیرا
تو مہر ہے ترے آگے سب قطرہائے شبنم — ان کا کہاں ٹھکانا جب ہو ظہور تیرا
اے چشمِ شوق وہ تو ہر رنگ میں ہے ظاہر — اب بھی جو تو نہ دیکھے تو ہے قصور تیرا
میں آئینہ ہوں تیرا تو آئینہ ہے میرا — تجھ میں ظہور میرا مجھ میں ظہور تیرا
خورشید و ماہ سب میں جلوے ہیں یہ ترے لیکن — ایسی کہاں ہیں آنکھیں دیکھیں جو نور تیرا

ناداں امیرؔ ناحق امیدوار تو ہے
دل لے کے پھیر دے گا وہ اب ضرور تیرا

عمر برق و شرار ہے دنیا — کتنی بے اعتبار ہے دنیا
داغ سے کوئی دل نہیں خالی — کیا کوئی لالہ زار ہے دنیا
ہر جگہ جنگ ہر جگہ ہے نزاع — عرصۂ کارزار ہے دنیا
آنے جانے پہ سانس کے ہے مدار — سخت ناپائدار ہے دنیا
ایک جھونکے میں ہے اِدھر سے اُدھر — چار دن کی بہار ہے دنیا

کوئی کافر کوئی مسلماں ہے
مجمعِ نور و نار ہے دنیا
بدتر اس کو سمجھ خزاں سے امیر
دیکھنے کو بہار ہے دنیا

تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر
سرفروشی کی تمنّا ہے تو سر پیدا کر
کوہ کن! کوہ کنی شیوۂ عشاق نہیں
ہے جو عاشق دلِ معشوق میں گھر پیدا کر
رنگ چاہے اگر اس باغ میں آزادی کا
نکہتِ گل کی طرح شوقِ سفر پیدا کر
قطرۂ اشک بنے گوہرِ گوشِ جاناں
آبرو اتنی تو اے دیدۂ تر پیدا کر
آخرت میں عملِ نیک ہی کام آئیں گے
پیش ہے تجھ کو سفر زادِ سفر پیدا کر
عشق بازی کا اگر حوصلہ رکھتا ہے امیر
دل جو لوہے کا تو پتھر کا جگر پیدا کر

رازِ توحید کا جو ظاہر ہو
ایک منظور ایک ناظر ہو
کوسِ رحلت سے آتی ہے آواز
کہ خبردار اے مسافر ہو
سخت منزل ہے امتحاں کی جگہ
ٹھہرے ایوب سا جو صابر ہو
اتنی وابستگی جہاں سے ہے کیا
شہر بیگانہ تم مسافر ہو
اوّلِ عشق میں یہ حال امیر
تم تو آغاز ہی میں آخر ہو

اِک ذرا دیکھ تو کیا کہتے ہیں مرنے والے
او غریبوں کے مزاروں پہ گزرنے والے
ہائے قاتل نہیں ملتا کہیں شمشیر بکف
سر ہتھیلی پہ لیے پھرتے ہیں مرنے والے
جتنے عارف ہیں وہ دنیا سے الگ رہتے ہیں
خضر کب گھر میں ہیں رہزن کے ٹھہرنے والے
روح نے پردے میں توبہ کے کیے لاکھ بناؤ
زاہد اس طرح سنورتے ہیں سنورنے والے
آسماں پر جو ستارے نکل آئے تو امیر
یاد آئے مجھے داغ اپنے اُبھرنے والے

پہلے نگاہ پھر مری دشمنِ حیا ہوئی — وہ ایک بھی نہ دوسری اے دلربا ہوئی

ہے بخشنے نہ بخشنے میں اُس کو اختیار — تو ہے گناہ گار کہے جا خطا ہوئی

رحم آگیا کریم کو محتاج دیکھ کر — حاجت ہی اس غریب کی حاجت روا ہوئی

عبرت یہ کہہ رہی ہے جوانوں کی قبر پر — یارو دیکھو! اُمنگ جوانی کی کیا ہوئی

وہ دیکھتے ہی بزم میں مجھکو بگڑ گئے — کچھ بات بھی تو کی نہیں یہ بات کیا ہوئی

غافل نزول ہی تو کمالِ عروج ہے — ق — خاکِ فنا ہی منزلِ آبِ بقا ہوئی

نقطے کی سیر دائرۂ معرفت میں دیکھ — تھی ابتدا جہاں سے وہیں انتہا ہوئی

گھبرا رہے ہو حشر میں کیوں اس قدر امیر
اتنی ہی سی تو بات ہے کہہ دو خطا ہوئی

سوالات

۱۔ امیر و داغ کا مقابلہ اور موازنہ کیجیے۔ ۲۔ اس طرز میں کہنے والے آج کل کون کون سے نمایاں شاعر ہیں؟

۳۔ امیر نے زبان کی کیا خدمت انجام دی؟

مزید مطالعہ کے لیے

(۱) طرۂ امیر۔

حالی

خواجہ الطاف حسین حالی کے حالات حصۂ نثر میں ملاحظہ فرمائیے۔

کہنے کی بات ہو تو اسے کہہ سنائیے — جو دل پہ بن رہی ہو وہ کیونکر دکھائیے

دنیا کی ہو ہوس تو دل و دیں گنوائیے — یاں کھوئیے بہت سا تو کچھ جا کے پائیے

یہ کیا کہ دل ہے دیر میں اور کعبے میں مقام — ہو رہیے بس وہیں کے جہاں دل لگائیے

گر جان کا ضرر ہے محبت میں ناصحو — ہم جان ہی سے بیٹھے ہیں بیزار جائیے

اور اعتبار کھوتے ہو اپنا رہا سہا — بس آگیا یقیں ہمیں قسمیں نہ کھائیے

ہوتی ہجوم غم میں ہے کیوں زہر کی تلاش
حالی بتائیں آپ کو گر کچھ کھلائیے

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق — رکھی ہے آج لذّتِ زخمِ جگر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور — عالم میں تم سے لاکھ سہی تم مگر کہاں

یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا ان کو مجھ سے ربط مگر اس قدر کہاں

واں اگر جائیں تو لے کر جائیں کیا — منہ اسے ہم جا کے یہ دکھلائیں کیا

آؤ اس کو لیں ہمیں جا کر منا — اس کی بے پروائیوں پہ جائیں کیا

دل کو مسجد سے نہ مندر سے ہے اُنس — ایسے وحشی کو کہیں بہلائیں کیا

جانتا دنیا کو ہے اک کھیل تو — کھیل قدرت کے تجھے دکھلائیں کیا

عمر کی منزل تو جوں توں کٹ گئی — مرحلے اب دیکھیے پیش آئیں کیا

مان لیجیے شیخ جو دعوے کرے
اک بزرگِ دیں کو ہم جھٹلائیں کیا
ہو چکے حالیؔ غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

سوالات

۱۔ حالیؔ نے غزل میں کیا اصلاح کی انکے کلام میں کیا خامیاں پائی جاتی ہیں؟
۲۔ حالیؔ کی قومی شاعری کا کیا مرتبہ ہے؟
۳۔ "اگر حالیؔ نہ ہوتے تو اقبال بھی نہ ہوتے" یہ کس حد تک صحیح ہے؟

شاد عظیم آبادی

خان بہادر سید علی محمد شاد (۱۸۴۶ء تا ۱۹۲۷ء) ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ لڑکپن میں عظیم آباد چلے گئے جو دلّی کے ویران ہو جانے کے بعد لکھنؤ کی طرح ایک ادبی مرکز بن گیا تھا۔ شاد کو آغاز شباب سے شاعری کا شوق تھا جس کی تکمیل سیّد شاہ اُلفت حسین فریاد، شاگرد خواجہ میر دردؔ سے کی۔ عمر کا بیشتر حصّہ شعر و سخن کی خدمت میں گذارا۔ قصیدے، قطعے، غزلیں، مثنویاں اور رباعیاں لکھیں لیکن سب سے زیادہ شہرت غزل اور مرثیہ میں حاصل کی۔ ان کا مجموعہ "کلام شاد" چھپ چکا ہے۔

شاد کے یہاں لکھنویت ہے۔ لیکن ایسی جذبات نگاری بھی ہے جو میر کی یاد دلاتی ہے۔ ناسخ کے سے صنائع و بدائع ہیں لیکن اعتدال سے زیادہ نہیں۔ ان کے یہاں اخلاق و فلسفہ کا بھی عنصر ہے۔ تغزّل میں سادگی و متانت ہے۔ سادہ ترکیبیں اور دلکش الفاظ ہیں۔ لکھنویت اور دہلویت کا خوشنما امتزاج ہے جس نے کلام میں ایک نئی انفرادیت پیدا کر دی ہے۔

(نئی شاعری)

اگر مرتے ہوئے لب پر نہ تیرا نام آئے گا
تو مَیں مرنے سے در گذرا مرے کس کام آئے گا

شب ہجراں کی سختی ہو تو ہو لیکن یہ کیا کم ہے
کہ لب پہ رات بھر رہ رہ کے تیرا نام آئے گا

عطا کی جب کہ خود پیرِ مغاں نے پی بھی لے زاہد
یہ کیسا سوچتا ہے تجھ پہ کیوں الزام آئے گا
کہاں سے لاؤں صبر حضرت ایوب اے ساقی
خُم آئے گا، صراحی آئے گی تب جام آئے گا

غضب نگاہ نے ساقی کی بندوبست کیا　　شراب بعد کو دی پہلے سب کو مست کیا
مئے خودی نے کچھ ایسا دلوں کو مست کیا　　کسی نے دھیان نہ پھر سوئے بود و ہست کیا
کوئی خفا ہو تو ہو امرِ حق مگر یوں ہے　　بتوں کی چال نے سب کو خدا پرست کیا
بہت سے جام تھے پیرِ مغاں کے پیشِ نگاہ　　کسی کو نیست کیا اور کسی کو ہست کیا
بلا سے صاف نہ دی، یہ شرف نہیں کچھ کم
سیاہ کاروں کو ساقی نے مے پرست کیا

نہ سر میں سودا نہ دل میں آہیں نہ لب پہ ساقی فغاں رہے گی
یہی جو ساماں رہا یہ نہ ہوں گے تو پھر محبت کہاں رہے گی
بنا چلا ڈھیر راکھ کا تو، بجھا چلا اپنے دل کی تسکین
بہت دنوں تک دبی دبائی یہ آگ اے کارواں رہے گی
بہت سے تنکے چُنے تھے میں نے نہ مجھ سے صیاد تو، خفا ہو
قفس میں گو مر بھی جاؤں گا میں نظر سوئے آشیاں رہے گی
ابھی سے ویرانہ پن عیاں ہے، ابھی سے وحشت برس رہی ہے
ابھی تو سنتا ہوں کچھ دنوں تک بہار اے آشیاں رہے گی
ہزار نقشِ قدم مٹا کر زمانہ آنکھوں میں خاک ڈالے
جو تجھ سے چھوٹے ہیں ان کو تیری تلاش اے کارواں رہے گی

ڈھونڈ گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم
میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم
مرغانِ ہوا نے پھولوں کو اے شادؔ یہ کہلا بھیجا ہے
آنا ہے اگر تو آجاوے ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

شب کو مری چشمِ حسرت کا سب دردِ دل ان سے کہہ جانا
دانتوں میں دبا کر ہونٹ اپنا کچھ سوچ کے ان کا رہ جانا
ہم باغ میں ناحق آئے تھے بُلبل کی حکایت سُننے کو
منقار کو رکھ کر پھولوں پر کچھ اپنی زباں میں کہہ جانا
یہ رات بھیانک ہجر کی ہے کاٹیں گے بڑے آلام سے ہم
کُھلنے کی نہیں یہ کالی بلا سمجھے ہی ہوئے تھے شام سے ہم
تھا موت کا کھٹکا جاں فرسا، صد شکر کہ نکلا وہ کانٹا
گر ہو نہ قیامت کا دھڑکا اب ہیں تو بڑے آرام سے ہم
اے ہم نفسو دم لینے دو وہ بھولے نغمے یاد آلیں
آئے ہیں چمن میں اُڑ کے ابھی چھوٹے ہیں ابھی دم دام سے ہم
وہ سمجھے کہ میں نے مار لیا ہم سمجھے ملیں گے آخر وہ
ملتے ہی نگہ کے دونوں خوش آغاز سے وہ انجام سے ہم
دنیا میں تخلّص کوئی نہ تھا کیا نیل کا ٹیکا شادؔ ہی تھا
تم وجہ نہ پوچھو کچھ اس کی چڑ جاتے ہیں کیوں اس نام سے ہم

سوالات

۱۔ شاؔد، میرؔ سے کہاں تک متاثر ہیں ؟

۲۔ شاؔد، حسرؔت اور فانیؔ کے پسندیدہ اشعار لکھیے اور ان کی خصوصیات کلام کو واضح کیجیے۔

ثاقبؔ لکھنوی

مرزا ذاکر حسین نام اور ثاقبؔ تخلص ہے۔ آپ کی پیدائش ۱۸۶۹ء میں بمقام آگرہ ہوئی۔ آپ کے والد اکبرآباد چھوڑ کر لکھنؤ چلے آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

مرزا ثاقبؔ فارسی میں بڑی اچھی دستگاہ رکھتے ہیں۔ عربی اور انگریزی سے بھی آشنا ہیں۔ ان کو تلاش معاش میں لکھنؤ اور کلکتہ اور آگرہ کے سفر کرنا پڑے۔ بالآخر ۱۹۰۸ء میں ریاست محمود آباد سے وابستہ ہوگئے۔ ابھی تک آپ کا قیام اسی ریاست میں ہے۔

مرزا ثاقبؔ، امیرؔ اور غالبؔ کے پیرو ہیں۔ ان کا ایک ضخیم دیوان بھی شائع ہوچکا ہے۔ اس میں زبان کی صفائی اور خیالات کی بلندی ہر جگہ دامن دل کو کھینچتی ہے۔ ان کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت پاکیزگی، لطافت، ہمواری اور زبان کی صفائی ہے۔

ہجر کی شب نالۂ دل وہ صدا دینے لگے\
سُننے والے رات کٹنے کی دعا دینے لگے

آیئے حالِ دلِ مجروح سُنئے دیکھیے
کیا کیا زخموں نے کیوں ٹانکے صدا دینے لگے

کس نظر سے آپ نے دیکھا دلِ مجروح کو
زخم جو کچھ بھر چلے تھے پھر ہوا دینے لگے

سُننے والے رو دیے سُن کر مریضِ غم کا حال
دیکھنے والے ترس کھا کر دعا دینے لگے

جز زمینِ کوے جاناں کچھ نہیں پیشِ نگاہ
جس کا دروازہ نظر آیا صدا دینے لگے

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقتِ دفن
زندگی بھر کی محبّت کا صلا دینے لگے

آئینہ ہو جائے میرا عشق ان کے حُسن کا
کیا مزہ ہو درد اگر خود ہی دوا دینے لگے

سینۂ سوزاں میں ثاقب گھُٹ رہا ہے وہ دھواں
اُف کروں تو آگ دنیا کی ہوا دینے لگے

کہاں تک جفا حُسن والوں کی سہتے
جوانی جو رہتی تو پھر ہم نہ رہتے

ہجومِ تمنّا سے گھُٹتے تھے دل میں
جو میں روکتا بھی تو نالے نہ رہتے

نشیمن نہ جلتا نشانی تو رہتی
ہمارا تھا کیا ٹھیک رہتے نہ رہتے

بناتے ہیں آنسو کر اب دل نہیں ہے
جو پانی نہ ہوتا تو دریا نہ بہتے

زمانہ بڑے شوق سے سُن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

کوئی نقش اور کوئی دیوار سمجھا زمانہ ہوا مجھ کو چپ رہتے رہتے

مری ناؤ اس غم کے دریا میں ثاقب
کنارے پر آہی لگی بہتے بہتے

مری قید کا دل شکن ماجرا تھا بہار آئی تھی آشیاں بن چکا تھا
میں دنیا کو ے خانہ سمجھا کہ اس میں کوئی ہنس رہا تھا کوئی رو رہا تھا
شبِ غم کی تنہائیوں کو نہ پوچھو
جدھر دیکھتا تھا خدا ہی خدا تھا

روتے روتے شام ہوئی ہے کب تک اشک بہائیں گی
بہتے بہتے تھمتے ہیں دریا آنکھیں بھی تھم جائیں گی
جاتے جاتے جسم سے جانیں اہلِ وفا کی جائیں گی
آتے آتے دل لینے کی تم کو راہیں آئیں گی
چونکو چونکو صبح پیری غفلت خواب جوانی سے
اُٹھو اُٹھو سونے والوں راتیں پھر بھی آئیں گی
لاتے لاتے کام میں اُلفت لائے گی زنجیروں کو
بڑھتے بڑھتے زلفیں تیری طوق کمر ہو جائیں گی
ہوتے ہوتے ہو گا ظالم واقف رسمِ اُلفت سے
رفتہ رفتہ میری وفائیں راہ پہ اس کو لائیں گی

سوالات

۱- ثاقب، میر و غالب کی پیروی میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں؟
۲- ثاقب کے کلام میں رطب و یابس بہت ہے۔ کیا ڈاکٹر اعجاز حسین کی یہ رائے درست ہے؟
۳- ثاقب اور شاد کے چند ہم مضمون اشعار لکھیے اور ان کا محاکمہ کیجیے۔

سید فضل الحسن حسرت موہانی

ولادت موہان ضلع اوناؤ ۱۸۷۵ء

ان کو بچپن ہی سے شعرائے قدیم کے کلام کے مطالعہ کا بہت زیادہ شوق تھا۔ یہ اثر ان کے کلام سے اسی قدر ظاہر ہوتا ہے جتنا ان کی ادبی خدمات سے۔ ۱۹۰۳ء میں علی گڈھ کالج سے امتحان بی۔اے پاس کیا۔ اس صدی کے شروع میں ایک رسالہ اُردوے معلی نکالا۔ جو بہت مشہور ہوا۔ شمالی ہند کے شعرائے متقدمین کے احوال و کلام سے عام واقفیت اسی رسالہ کے ذریعہ سے ہوئی۔

حسرت۔ تسلیم لکھنوی کے شاگرد ہیں۔ اودھ کے پرگو شعرا میں گنے جاتے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا احسان اُردو غزل کو از سرِ نو زندہ کرنا ہے۔ اس زمانے میں جب غزل کے تمام اسالیب پژمردہ ہو چکے تھے حسرت ہی نے اس کو از سرِ نو تازہ کیا۔ اور وہ اس طرح کہ غزل کے لیے ایک نیا راستہ کھول دیا۔ آج حسرت ایک اسکول شاعری کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔

حسرت کا زیادہ تر کلام غزلیں ہی ہیں۔ غزل اُردو کی ایک فرسودہ صنعت مان لی گئی تھی۔ اور فضول تکلفات اور بناوٹ اور تصنع کی وجہ سے بے مزہ اور غیر دلچسپ ہو گئی تھی۔ حسرت نے غزل کو مؤثر اور دلچسپ بنایا اور باوجودیکہ حسرت اساتذہ قدیم کی شدت سے پیروی کرتے ہیں لیکن پھر بھی ایک شان امتیاز و انفرادیت اُن کے کلام کا

نمایاں جوہر ہے۔ زمانۂ انحطاط و تنزل میں جو عیوب ہمارے ادب کے لیے مضرت رساں بن گئے تھے۔ حسرت کا کلام ان سے یکسر معرّا ہے اس کے ساتھ ہی حسرت کی غزل میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جن کی وجہ سے غزل کو دورِ قدیم میں اہمیت اور ہردلعزیزی حاصل تھی۔ خواجہ میر درد۔ میر۔ سودا۔ مصحفی۔ مومن۔ غالب اور نسیم کے کلام کا مطالعہ امعان نظر سے کیا ہے۔ انھیں کے کلام کی پیروی نہایت صداقت اور وفاشعاری کے ساتھ کرتے ہیں ؎

غالب و مصحفی و میر و نسیم و مومن
طبع حسرت نے اُٹھایا ہے ہر اُستاد سے فیض

سیدھے سادے خیالات دلچسپ اور روزمرّہ کی گفتگو میں پیش کرنا میر کا خاص وصف ہے۔ یہ وصف حسرت کو بھی نصیب ہوا ہے حسرت کی زبان سشستہ و رفتہ اور ان کا طرز بیان رواں شگفتہ اور خوشنما ہے ان کی نرالی ترکیبیں۔ ان کے بولتے ہوئے فقرے۔ ان کے بانکے اور اچھوتے ٹکڑے ازبس پُرکیف اور وجدآور ہیں جو سُننے والے کے دل میں تیر کی طرح اُتر جاتے ہیں۔" میر کے بعد غزل میں ایسی زبان بہت کم استعمال ہوئی ہے۔ داغ سطحی اور زود فنا جذبات کی ترجمانی کرنے میں پوری مہارت رکھتے ہیں۔ حسرت کے یہاں وقتی جذبات کم ہیں۔ کلام کی صفائی کا یہ عالم ہے کہ کوئی بدنما لفظ شاذ ہی ملے گا میر کی طرح حسرت کی زندگی بھی مایوسی کی زندگی ہے اسی وجہ سے میر کی طرح حسرت کے کلام میں حزن و قنوط کی فراوانی ہے لیکن ان کے کلام میں حزن و قنوط اس قدر عمیق نہیں جتنا میر کے یہاں ہے۔ شاید اپنی قسمت پر قناعت کرتے ہیں حسرت کی

شاعری بھی عاشقانہ شاعری ہے لیکن وہ حسن بسیط کے والہ وشیدا ہیں، اور اس وجہ سے متاخرین کی شاعری سے ان کی شاعری بے حد ممتاز ہو گئی ہے۔

سرگرمِ نازِ آپ کی شانِ جفا ہے کیا
باقی ستم کا اور ابھی حوصلا ہے کیا

گر جوشِ آرزو کی ہیں کیفیتیں یہی
مَیں بھول جاؤں گا کہ مرا مدعا ہے کیا

آتے ہیں کیوں خیال میں میرے وہ بار بار
عشق خدا نما کی یہی ابتدا ہے کیا

چل بھی دیے وہ چھین کے صبر و قرارِ دل
ہم سوچتے ہی رہ گئے یہ ماجرا ہے کیا

نزدیک بام یار سے ہے نردبانِ عشق
اے دل یہ جائے حوصلہ ہے دیکھتا ہے کیا

میری خطا پہ آپ کو لازم نہیں نظر
یہ دیکھیے مناسبِ شانِ عطا ہے کیا

دیکھو جسے ہے راہِ فنا کی طرف رواں
تیرے محل سرا کا یہی راستا ہے کیا

حسرت جفائے یار کو سمجھا جو تو وفا
آئینِ اشتیاق میں یہ بھی روا ہے کیا

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں
آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

بے زبانی ترجمانِ شوق بے حد ہو تو ہو
ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں

مٹ رہی ہیں دل سے یادیں روزگارِ عیش کی
اب نظر کاہے کو آئیں گی یہ تصویریں کہیں

التفاتِ یار تھا اک خوابِ آغازِ وفا
سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں

تیری بے صبری ہے حسرت خام کاری کی دلیل
گریۂ عشاق میں ہوتی ہیں تاثیریں کہیں

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرت
اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

جاں کہ پئے دوست رواں ہو گئی
بے خبرِ کون و مکاں ہو گئی

یاس سے اب یوں کہ چشمِ اُمید
پھر تری جانب نگراں ہو گئی

دلبریِ حسن ترے عہد میں
فتنۂ ہر پیر و جواں ہو گئی

ہم سے تھی مخصوص پھر اب وہ نظر
مایۂ نازِ دگراں ہو گئی

جسم کی تکلیف ترے شوق میں
میرے لیے راحتِ جاں ہو گئی

ضبط سے حسرت نہ چھپا رازِ غم
حالتِ دل صاف عیاں ہو گئی

برکتیں سب ہیں عیاں دولتِ روحانی کی
واہ کیا بات ہے اس چہرۂ نورانی کی

شوق دیکھے تجھے کس آنکھ سے اے مہرِ جمال
کچھ نہایت ہی نہیں تیری درخشانی کی

مجھ سے وہ سگ بھی ہو افضل جسے عزت ہے نصیب
آستانِ حرمِ یار پہ دربانی کی

جب سنا یاد کیا کرتے ہو تم بھی تو مجھے
کیا کہوں حد نہ رہی کچھ مری حیرانی کی

سعیِ احباب کو ناحق ہے رہائی کا خیال
اور ہی کچھ ہے تمنا تری زندانی کی

وہ تبسم بھی قیامت ہے ترا بعدِ جفا
تو نے دی ہو جسے خدمت نمک افشانی کی

مشکلوں سے جو مقابل ہوئی ہمت میری
قدر باقی نہ رہی عیش و تن آسانی کی

رہ گیا جل کے تری بزم میں پروانہ جو رات
کھنچ گئی شکل مری سوختہ سامانی کی

رشکِ شاہی ہو نہ کیوں اپنی فقیری حسرتؔ
کب سے کرتے ہیں غلامی شہِ جیلانی کی

تاثیرِ برقِ حُسن جو ان کے سخن میں تھی
اک لرزشِ خفی مرے سارے بدن میں تھی
اک رنگِ التفات بھی اس بے رُخی میں تھا
اک سادگی بھی اس نگہِ سحر فن میں تھی
محتاجِ بوئے عطر نہ تھا جسمِ خوبِ یار
خوشبوئے دلبری تھی جو اس پیرہن میں تھی
معلوم ہو گئی مرے دل کو زراہِ شوق
وہ بات پیار کی جو ہنوز اس دہن میں تھی
غربت کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ روشنی
جو روشنی کہ شامِ سوادِ وطن میں تھی
اچھا ہوا کہ خاطرِ حسرتؔ سے مٹ گئی
ہیبت سی اک جو خطرۂ دار و رسن میں تھی

خوب رویوں سے یاریاں نہ گئیں
دل کی بے اختیاریاں نہ گئیں
عقل صبر آشنا سے کچھ نہ ہوا
شوق کی بے قراریاں نہ گئیں
تھے جو ہم رنگِ ناز ان کے ستم
دل کی اُمّید واریاں نہ گئیں
مے و مینا سے یاریاں نہ گئیں
میری پرہیزگاریاں نہ گئیں
اشکباری سے سوزِ دل نہ مٹا
آہ کی شعلہ باریاں نہ گئیں
حُسن کی دل فریبیاں نہ گھٹیں
عشق کی تازہ کاریاں نہ گئیں

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام
اللہ رے جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام
نشو و نمائے سبزہ و گل ہے بہار میں
شادابیوں نے گھیر لیا ہے چمن تمام
اس نازنیں نے جب سے کیا ہے وہاں قیام
گلزار بن گئی ہے زمینِ دکن تمام

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم
گھبرا گئے ہیں بیدلئی ہمرہاں سے ہم
کچھ ایسی دور بھی تو نہیں منزلِ مُراد
لیکن یہ جب کہ چھوٹ چلیں کارواں سے ہم
ہے انتہائے یاس بھی اک ابتدائے شوق
پھر آ گئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم

سوالات

۱۔ حسرت موہانی نے غزل کا احیا کیا، اس کا کیا مفہوم ہے؟
۲۔ حسرت کا دوسرے غزل گو شعرا سے موازنہ کیجیے۔
۳۔ حسرت کا مرتبہ اُردو ادب کے دورِ جدید میں کیا ہے؟
۴۔ حسرت کے کلام کی خصوصیات کیا ہیں؟
۵۔ حسرت کی سیاسی زندگی کا ان کی شاعری پر کیا اثر پڑا؟
۶۔ "حسرت کی شاعری ان کے بقائے دوام کا موجب ہوگی" (عبد الحق) ثابت کیجیے۔
۷۔ "حسرت کے یہاں صحیح تغزل موجود ہے" مثالیں دے کر سمجھائیے۔
۸۔ "حسرت نے غزل کے تنِ بیجان میں جان ڈالی" یہ کہاں تک صحیح ہے۔

مزید مطالعہ کے لیے

(۱) حسرت موہانی عبد الشکور۔
(۲) کلیاتِ حسرت۔

ڈاکٹر سر اقبال

ڈاکٹر سر محمد اقبال (۱۸۷۵ء۔ ۱۹۳۸ء) سیالکوٹ میں پیدا ہوئے وہیں انگریزی پڑھی اور سیّد میر حسن سے فارسی اور عربی کی تکمیل کی۔ شعر کہنے کا شوق شروع ہی سے طبیعت میں تھا۔ چنانچہ ارشد گورگانی سے استفادہ کیا۔ داغ سے تحریری اصلاح لی اور مرزا غالب سے معنوی فیض حاصل کیا۔ لاہور سے ایم، اے کیا۔ پروفیسر آرنلڈ سے علم فلسفہ سیکھا۔

حمایت اسلام کے جلسوں میں شرکت کی اور قومی نظمیں لکھیں۔ اس کے بعد مخزن کے لیے کچھ نظمیں لکھیں جنمیں وطنیت کا عنصر غالب ہے۔ ۱۹۰۵ء میں ولایت گئے اور وہاں میگ ٹیگرٹ، براؤن، نکلسن اور سارلی کی رہنمائی میں حیرت انگیز ترقی کی۔ مشرقی اور مغربی علوم کا تنقیدی نگاہ سے مطالعہ کیا۔ کیمبرج یونیورسٹی سے علمی تحقیقات کے عوض فلسفہ اخلاق کی ڈگری حاصل کی اور میونخ یونیورسٹی نے فلسفہ ایران پر ایک محققانہ کتاب لکھنے کے صلہ میں "ڈاکٹر آف فلاسفی" کی ڈگری عطا کی۔ انگلستان میں اسلام کی حقیقت پر چھ لکچر دیے جو بہت مقبول ہوئے اور آرنلڈ کی جگہ لندن یونیورسٹی میں چھ مہینے عربی کے پروفیسر بھی رہے۔

یورپ میں اقبال کی شاعری کا زاویہ نگاہ بدل گیا۔ مغرب کی مادّہ پرستی اور اس کی خرابیوں کے راز ان پر منکشف ہو گئے۔ اسی کے

ساتھ ساتھ اسلامی فلسفہ کی تحقیق نے انھیں حقیقی اسلام اور مسلمانوں کی دیرینہ عظمت سے باخبر کر دیا چنانچہ اس کے بعد سے قرآن کے فلسفہ ہی کو اُنھوں نے اپنی شاعری کا محور بنا لیا۔ اب ہندی مسلمانوں کے بجاے تمام اسلامی دنیا ان کی طرف مخاطب تھی۔

یورپ سے آنے کے بعد انھوں نے لاہور میں بیرسٹری شروع کر دی۔ ان کی شاعری کی عالمگیر مقبولیت سے متاثر ہو کر گورنمنٹ نے انھیں سر کا خطاب دیا۔ علی گڈھ۔ پنجاب اور الہ آباد نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگریاں عطا کیں اور آکسفورڈ یونیورسٹی نے روڈس ٹرسٹ کی طرف سے فلسفیانہ لکچر دینے کے لیے مدعو کیا۔ اُردو میں بانگ درا، بالِ جبرئیل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز ان کے مشہور و مقبول مجموعے ہیں۔ فارسی کی کئی کتابیں ہیں جن کی شہرت ہندوستان سے نکل کر تمام متمدن دنیا تک پھیل چکی ہے۔

علامہ اقبال کے نظامِ فکر کے چند اہم مسائل یہ ہیں:۔

(۱) فرد کی اہمیت اور خودی کی تربیت۔

(۲) نظامِ عالم میں انسان کا مقام بلند اور اس کے استعمال کے وسیع و لامحدود امکانات۔

(۳) مادی ترقی کی کوششوں میں تزکیۂ روحانی کی ضرورت جس کے بغیر مادی ترقی ہلاکت اور بربادی کا پیش خیمہ ہے۔

(۴) اقوامِ یورپ کو یہ پیغامِ عبرت کہ اگر وہ روحانیت سے بیزار ہو کر "این جہانی" تصوّرِ حیات پر مصر رہیں تو ان کی تہذیب تباہ ہو کر رہے گی۔

(۵) اقوامِ مشرق علی الخصوص مسلم اقوام مشرق میں روحانی فضیلت اور برتری کا از سرِ نو احساس پیدا کرنا۔

اقبال نے اِن حکیمانہ اور فلسفیانہ مسائل کو اس سلیقے کے ساتھ آب و رنگ شاعری میں سمو کر پیش کیا ہے کہ دل و نظر ان میں جذب ہو کر رہ جاتے ہیں اور بعض وقت سخن آرائی خود طرزِ ادا کی ندرت و طرفگی پر وجد کرنے لگتی ہے۔ اقبال کے علوئے شعری کا اعتراف ہر چہار طرف ہوا ہے۔ مسز سروجنی نائیڈو ایک خط میں لکھتی ہیں:۔

> اقبال کی شاعری نے میری روح کو وطنیت کی سلاسل سے آزاد کر کے اس میں ایک نئی روح پھونک دی ہے اور مجھ میں تمام بنی نوع انسان سے محبت کرنے کی جسارت اور قابلیت پیدا کر دی ہے۔"

اقبال کی غزلوں میں "روحانیت" اور واقعیت کی آمیزش ہے۔ علوم جدیدہ، سیاسیات، حیات اور کائنات کے عالمگیر مسائل مشرق و مغرب کی آویزش، نئی ذہنیت اور نئے وجدان کے ایسے نقوش بالِ جبریل اور ضربِ کلیم کی غزلوں میں ملتے ہیں کہ ان سے اُردو شاعری میں بالکل ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ انھوں نے غزل کو قومیاتِ شعری میں داخل کر کے اس سے نظم کا کام لیا ہے اور اسی لیے اس میں تسلسلِ خیال پایا جاتا ہے۔ لیکن ان کوششوں نے بعض بعض اشعار کی شعریت کو سخت صدمہ پہنچایا۔

(نئی شاعری۔ خواجہ احمد فاروقی)

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

عشق فرمودۂ قاصد سے سُبک گامِ عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنیِ پیغام ابھی

عذرِ پرہیز یہ کہتا ہے بگڑ کر ساقی
ہے ترے دل میں وہی کاوشِ انجام ابھی

ابرِ نیساں! یہ تنک بخشیِ شبنم کب تک
میرے کہسار کے لالے ہیں تہی جام ابھی

بادہ گردانِ عجم و عربی میری شراب
میرے ساغر سے جھجکتے ہیں مے آشام ابھی

خبر اقبال کی لائی ہے گلستاں سے نسیم
نَو گرفتار پھڑکتا ہے تہِ دام ابھی

گیسوے تاب دار کو اور بھی تاب دار کر
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

عشق بھی ہو حجاب میں حُسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر

تو ہے محیطِ بے کراں میں ہوں ذرا سی آب جو
یا مجھے ہم کنار کر یا مجھے بے کنار کر

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو
میں ہوں خزف تو تو مجھے گوہرِ شاہوار کر

نغمۂ نو بہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو
اس دمِ نیم سوز کو طائرکِ بہار کر

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

سوالات

۱۔ غزلِ مسلسل سے کیا مُراد ہے؟ اُردو میں مسلسل غزلیں کس نے لکھی ہیں؟
۲۔ اقبال کا بہ حیثیت غزل گو کیا مرتبہ ہے؟
۳۔ اقبال کے نزدیک "عشق" کا کیا مفہوم ہے؟

مزید مطالعہ کے لیے

(۱) روحِ اقبال ڈاکٹر یوسف حسین۔
(۲) اقبال نمبر (رسالہ اُردو)
(۳) سیرتِ اقبال
(۴) جوہر (اقبال نمبر)

فانی

شوکت علی خاں نام ہے اور فانی تخلص۔ آپ کی ولادت ۱۸۷۹ء میں ہوئی۔ ان کے جد امجد کابل سے آکر ہندوستان میں سکونت گزیں ہوئے ان کی جائداد ایک سو چوراسی مواضعات معافی پر مشتمل تھی مگر ۱۸۵۷ء کی رستخیز بیجا میں سب تباہ و برباد ہوگئی۔

فانی کے والد مرحوم محمد شجاعت علی خاں محکمۂ پولیس میں انسپکٹر تھے مگر ملازمت کو غلامی سے بدتر سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے اپنے بیٹے فانی کو وکالت کا آزاد پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ لیکن فانی کو اوائل عمر سے شعر و سخن کا ذوق تھا اس لیے انھوں نے وکالت کی طرف کبھی خاص توجہ نہیں کی۔

۱۸۹۹ء میں فانی نے ایک حادثۂ جانگاہ سے متاثر ہو کر شوکت کے بجائے فانی تخلص رکھا۔ اس زمانے کا بہت سا کلام تلف ہوگیا ہے لیکن جو باقی رہ گیا ہے وہ 'باقیات فانی' کے نام سے مشہور ہے۔ فانی کے کلام میں حزن و یاس کی فراوانی ہے۔ اسی وجہ سے رشید احمد صدیقی نے انھیں یاسیات کا امام کہا ہے۔ جوش نے انھیں بیوۂ عالم اور جنازہ بردوش شاعر کے تحقیر آمیز الفاظ سے یاد کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے حزن و ملال میں بھی ایک دلکشی ہے۔ بعض بعض جگہ انھوں نے غالب کی طرح فلسفہ طرازی بھی کی ہے جس کی وجہ سے بعض اشعار بہت بلند ہوگئے ہیں اور بعض کورانہ تقلید کی وجہ سے بہت پست۔ لیکن

بحیثیت مجموعی یہ ماننا پڑے گا کہ ان کا مرتبہ سخنورانِ عصرِ جدید میں بہت بلند ہے۔

فانی کا ایک نیا مجموعہ عرفانیات فانی کے نام سے بھی شایع ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر زمانے میں ان کے کلام میں اُستادانہ پختگی اور رچہ گیری آگئی تھی۔

سانس بن گیا اک اک نالہ نارسا ہو کر ‎ ‎ ‎ ‎ نامراد اپنے تک نامراد جیتے ہیں
تھی ہماری قسمت میں بندگی خدا ہو کر ‎ ‎ ‎ ‎ اور بندے میں جن کو دعویٔ خدائی ہے

بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے مرتے ہیں نہ جیتے ہیں
درد پر خدا کی مار دل میں رہ گیا ہو کر

جی ڈھونڈتا ہے گھر کوئی دونوں جہاں سے دور
اس آپ کی زمیں سے الگ آسماں سے دور
شاید میں درخورِ نگہِ گرم بھی نہیں
بجلی تڑپ رہی ہے مرے آشیاں سے دور
ہے منع راہِ عشق میں دیر و حرم کا ہوش
یعنی کہاں سے پاس ہے منزل کہاں سے دور
تا عرضِ شوق میں نہ رہے بندگی کی لاگ
اک سجدہ چاہتا ہوں ترے آستاں سے دور
فانی دکن میں آ کے یہ عقدہ کھُلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

زندگانی سے زندگانی تک ‎ ‎ ‎ ‎ موت ہے اک وقفۂ موہوم
بات پہنچی تری جوانی تک ‎ ‎ ‎ ‎ ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم
یہ زندگی کی ہے رُوداد مختصر فانیؔ
وجودِ درد مسلّم علاج نامعلوم

دل وقفِ تپش ہے ہائے مگر وجہِ تپشِ دل کوئی نہیں
بسمل ہوں مگر کیوں بسمل ہوں فریاد کہ قاتل کوئی نہیں
کس زعم میں ہے اے راہرِ غم دھوکے میں نہ آنا منزل کے
یہ راہ بہت کچھ چھانی ہے اس راہ میں منزل کوئی نہیں
بس اُن پہ نہ ان کی یاد پہ ہے تقدیر سے کیا کیا پہلو ہیں
تدبیر سے حاصل کچھ بھی نہیں تدبیر سے غافل کوئی نہیں
خود حسنِ کمالِ حسن ہے یعنی حسن جہاں ہے کامل ہے
اور عشق مآلِ عشق ہے یعنی عشق میں کامل کوئی نہیں
ہستی ہی نہیں جو باطل ہو پھر فرقِ مجاز و حقیقت کیا
ہر عرض حقیقت ہے وہ حقیقت ہستیٔ باطل کوئی نہیں
فانیؔ ہی وہ اک دیوانہ تھا جو موت سے پہلے مر جاتا
کیا ہوش کی کافر دنیا میں اس موت کے قابل کوئی نہیں

دُنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے
جگ سونا ہے تیرے بغیر آنکھوں کا کیا حال ہوا
جب بھی دُنیا بستی تھی اب بھی دنیا بستی ہے
آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ اُمڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

دل کا اجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے

فانی جس میں آنسو کیا دل کے لہو کا کال نہ تھا
ہائے وہ آنکھ اب پانی کی دو بوندوں کو بھی ترستی ہے

سوالات

۱۔ "فانی یاسیات کے امام ہیں" توضیح کیجیے۔

۲۔ فانی کے کلام میں یاس کی فراوانی کیوں ہے؟ ان کے فلسفۂ غم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھیے۔

۳۔ فانی نے مسئلہ جبر و قدر کے بارے میں کیا کہا ہے؟

مزید مطالعہ کے لیے

(۱) فانی نمبر علی گڑھ میگزین
(۲) باقیات فانی و عرفانیات فانی

عزیز لکھنوی

۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ اُن کی حیثیت اُردو شاعری میں میل راہ کی سی ہے۔ ان کے یہاں قدیم اور جدید دونوں طرز آکر مل گئے ہیں۔

عزیز کے بزرگوار شیراز سے کشمیر اور پھر لکھنؤ آئے۔ عزیز نے تحصیلِ علم میں پوری کوشش کی اور خاندانی علم و فضیلت کو قائم رکھا۔ انھیں فارسی میں حافظ، عرفی، اور نظیری کا رنگ پسند تھا۔ اور اُردو میں میر اور غالب کا۔ عزیز زمانہ شناس تھے انھوں نے قدیم راستے کو چھوڑ کر اُردو شاعری کو فرسودگی اور ابتذال کے گرداب سے نکالا اور طرز ادا کی ندرت، خیال کی بلندی، اور ایک نئی معنویت سے غزل کو چار چاند لگا دیے۔

عزیز نے قصیدے بھی لکھے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ مردہ صنفِ سخن میں جان ڈال دی ہے۔ ہر قصیدے میں الفاظ کا شکوہ طمطراق اور تخیّل کی بلندی نظر آتی ہے۔ ان کی غزلیات کا مجموعہ گلکدہ صحیفۂ ولا اور قصائد عزیز شایع ہو چکے ہیں۔

جلوہ دکھلائے جو وہ اپنی خود آرائی کا
نور جل جائے ابھی چشمِ تماشائی کا

رنگ ہر پھول میں ہے حسنِ خود آرائی کا
چمنِ دہر ہے محضر تری یکتائی کا

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

اُف ترے حسنِ جہاں سوز کی پرزور کشش
نور سب کھینچ لیا چشمِ تماشائی کا

دیکھ کر نظمِ دو عالم ہمیں کہنا ہی پڑا
سلسلہ ہے یہ کسی انجمن آرائی کا

گل جو گلزار میں ہیں گوش بر آواز عزیز
مجھ سے بلبل نے لیا طرز یہ شنوائی کا

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا
وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا

واہمہ مجھ کو دکھاتا ہے جنوں کے ساماں
نظر آتا ہے مجھے گھر کا بیاباں ہونا

حادثے دونوں یہ عالم میں اہم گذرے ہیں
میرا مرنا تری زلفوں کا پریشاں ہونا

جوش میں لے کے اک انگڑائی کسی کا کہنا
تم کو آتا ہی نہیں چاک گریباں ہونا

سُرخ ڈورے تری آنکھوں کے الٰہی توبہ
چاہیے تھا انھیں پیوست رگِ جاں ہونا

ہو چلیں آپ کے بیمار کی آنکھیں بے نور
قہر تھا صبح کے تارے کا نمایاں ہونا

ان سے کرتا ہے دمِ نزع وصیت یہ عزیز
خلق روئے گی مگر تم نہ پریشاں ہونا

وہ نگاہیں کیا کہوں کیونکر رگِ جاں ہو گئیں
دل میں نشتر بن کے ڈوبیں اور پنہاں ہو گئیں

تھیں جو کل تک جلوہ افروزی سے شمعِ انجمن
آج وہ شکلیں چراغِ زیرِ داماں ہو گئیں

اک نظر گھبرا کے کی اپنی طرف اس شوخ نے
ہستیاں جب مٹ کے اجزاے پریشاں ہو گئیں

اُڑ کے دل کی خاک کے ذرے گئے جس جس طرف
رفتہ رفتہ وہ زمینیں سب بیاباں ہو گئیں

اس کی شامِ غم پہ صدقے ہو مری صبحِ حیات
جس کے ماتم میں تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

یہ مشورہ بہم اُٹھے ہیں چارہ جو کرتے
کہ اب مریض کو اچھا تھا قبلہ رو کرتے

زباں اُرک گئی آخر سحر کے ہوتے ہی
تمام رات کٹی دل سے گفتگو کرتے

سوادِ شہرِ خموشاں کا دیکھیے منظر
سُنا نہ ہو جو خموشی کو گفتگو کرتے

یقیں تھا کہ طنابیں زمیں کی کھنچ جاتیں	بجدّ سعی اگر اس کی جستجو کرتے

تمام رونے کی لذّت اسی پہ تھی موقوف	کہ زندگی میں کبھی تم سے گفتگو کرتے

جواب حضرتِ ناصح کو ہم بھی کچھ دیتے	جو گفتگو کے طریقے سے گفتگو کرتے

پہنچ کے حشر کے میداں میں بھول کیوں ہے عزیزؔ
ابھی تو پہلی ہی منزل ہے جستجو کرتے

اصغر گونڈوی

اصغر کا اصلی وطن گورکھپور کے ضلع میں ہے لیکن ان کے والد اتنے عرصے تک گونڈے میں رہے کہ لوگ اصغر کو اسی نسبت سے یاد کرنے لگے وہ ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم معمولی اور غیر مستقل طور پر حاصل کی۔ لیکن انھوں نے عربی، فارسی اور انگریزی سے اتنی مناسبت پیدا کر لی تھی کہ ذاتی مطالعہ کتب میں کبھی وقت محسوس نہیں کی۔

اصغر بہت کم گو شاعر تھے لیکن انھوں نے اپنے لب و لہجے کی جدت آمیز اور معتدل رنگینی سے بہت جلد لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ان کے کلام میں ایک قسم کی سرمستی نشاط کی کیفیت اور حقائق و معارف کے رموز ملتے ہیں۔ ہر شعر میں ان کی متانت اور لطافت جلوہ گر ہے۔ ان کی تشبیہیں اور ان کے استعارے پاکیزہ اور نادر ہیں۔

اصغر کو قاضی عبد الغنی صاحب منگلوری سے شرف بیعت حاصل تھا۔ اسی لیے ان کے یہاں صوفیانہ مضامین کی بھی کثرت ہے۔ لیکن اس میں وہ سوز اور کیفیت ہے جو اچھی شاعری کی لازمی خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔

اصغر کا انتقال ۱۹۳۶ء میں ہوا۔

رُخِ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی
شعاعیں کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی

نقاب اس نے الٹ کر یہ حقیقت ہم پہ کی عریاں
یہیں پر ختم ہو جاتی ہیں بحثیں کفر و ایماں کی

حقیقت کھول دیتا میں جنوں کے رازِ پنہاں کی
قسم دے دی ہے لیکن قیس نے چاکِ گریباں کی
اسیرانِ بلا کی حسرتوں کو آہ کیا کہیے
تڑپ کے ساتھ اونچی ہو گئی دیوارِ زنداں کی

ترے جلووں کے آگے ہمتِ شرحِ بیاں رکھ دی
زبانِ بے نگہ رکھ دی نگاہِ بے زباں رکھ دی
مٹی جاتی ہے بلبل جلوۂ گل ہائے رنگیں پر
چھپا کر کس نے ان پردوں میں برقِ آشیاں رکھ دی
کرشمے حسن کے پنہاں تھے شاید رقصِ بسمل پر
بہت کچھ سوچ کر ظالم نے تیغِ خوں فشاں رکھ دی
الٰہی کیا کیا تو نے کہ عالم میں تلاطم ہے
غضب کی ایک مشتِ خاک زیرِ آسماں رکھ دی

بے محابا ہو اگر حسن تو وہ بات کہاں — چھپ کے جس شان سے ہوتا ہے نمایاں کوئی
خرمنِ گل سے لپٹ کر وہیں مر جانا تھا — اب کرے کیوں گلۂ تنگیٔ داماں کوئی
کیا مرے حال پہ سچ مچ انھیں غم تھا قاصد
تو نے دیکھا تھا ستارہ سرِ مژگاں کوئی

گلوں کی جلوہ گری مہر و مہ کی بوالعجبی — تمام شعبدہ ہائے طلسمِ بے سببی
گذر گئی ترے مستوں پہ یہ بھی تیرہ شبی — نہ کہکشاں نہ ثریا نہ خوشۂ عنبی
یہ زندگی ہے یہی اصلِ علم و حکمت ہے — جمالِ دوست و شبِ ماہ و بادۂ عنبی
فروغِ حسن سے تیرے چمک گئی ہر شے — ادا و رسمِ ہلالی و طرزِ بولہبی
ہجومِ غم میں نہیں کوئی تیرہ بختوں کا — کہاں ہے آج تو اے آفتابِ نیم شبی

سرشتِ عشق طلب اور حسن بے پایاں حصول تشنہ لبی ہے شدید تشنہ لبی
دلوں سے عشق نے بھی شورشیں اُڑا دی ہیں جہاں سے تو نے بھی خندہ ہائے زیر لبی
کشش نہ جام نگاریں کی پوچھ اے ساقی!
جھلک رہا ہے مرا آب و رنگ تشنہ لبی

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا
میں کامیاب دید بھی محروم دید بھی جلووں کے اژدہام نے حیراں بنا دیا
یوں مسکرا کے جان سی کلیوں میں پڑ گئی یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا
کچھ شورشوں کی نذر ہوا خونِ عاشقاں کچھ جم کے رہ گیا اسے حرماں بنا دیا
اے شیخ وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی کچھ قید و رسم نے جسے ایماں بنا دیا
کچھ آگ دی ہوس میں تو تعمیر عشق کی جب خاک کر دیا اسے عرفاں بنا دیا
کیا کیا قیود دہر میں ہیں اہلِ ہوش کے ایسی فضائے صاف کو زنداں بنا دیا
اک برق تھی ضمیر میں فطرت کے موج زن آج اس کو حسن و عشق کا ساماں بنا دیا
مجبوریٔ حیات میں رازِ حیات ہے زنداں کو میں نے روزنِ زنداں بنا دیا
وہ شورشیں نظامِ جہاں جن کے دم سے ہے جب مختصر کیا انھیں انساں بنا دیا
ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا
بلبل بہ آہ و نالہ و گل مستِ رنگ و بو مجھ کو شہیدِ رسمِ گلستاں بنا دیا
کہتے ہیں اک فریبِ مسلسل ہے زندگی
اس کو بھی وقفِ حسرت و حرماں بنا دیا

وہ نغمہ بلبلِ رنگیں نوا اک بار ہو جائے کلی کی آنکھ کھل جائے چمن بیدار ہو جائے
نظر وہ ہے جو اس کون و مکاں کے پار ہو جائے مگر جب روئے تاباں پر پڑے بیکار ہو جائے
تبسم کی ادا سے زندگی بیدار ہو جائے نظر سے چھیڑ دے رگ رگ مری ہشیار ہو جائے

تجلی چہرۂ زیبا کی ہو کچھ جامِ رنگیں کی
زمیں سے آسماں تک عالمِ انوار ہو جائے

تم اس کافر کا ذوقِ بندگی اب پوچھتے کیا ہو
جسے طاقِ حرم بھی ابروئے خمدار ہو جائے

سحر لائے گی کیا پیغامِ بیداری شبستاں میں
نقابِ رُخ اُلٹ دو خود سحر بیدار ہو جائے

نظر اس حسن پر ٹھیرے تو آخر کس طرح ٹھیرے
کبھی جو پھول بن جائے کبھی رخسار ہو جائے

کچھ ایسا دیکھ کر چپ ہوں بہارِ عالمِ امکاں
کوئی اک جام پی کر جس طرح سرشار ہو جائے

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

سوالات

۱۔ آصغر کے تصوّف پر ایک نوٹ لکھیے۔

۲۔ "آصغر کے تغزّل میں شگفتگی ہے" اسے مثالیں دے کر ثابت کیجیے۔

مزید مطالعہ کے لیے

(۱) آصغر۔ مُرتّبہ عبدالشکور۔

(۲) نشاطِ روح۔ سرودِ زندگی۔

فراق گورکھپوری

پروفیسر رگھوپت سہائے فراق ایم، اے کی پیدائش ۱۸۹۶ء میں ایک کائستھ گھرانے میں ہوئی۔ ایم، اے تک برابر چوٹی کے کامیاب طلباء میں رہے۔ بی، اے کے بعد ہی ڈپٹی کلکٹری کی ملازمت ملی۔ اور آئی، سی، ایس کے لیے نامزد ہوئے لیکن عدم تعاون کی تحریک میں ملازمت چھوڑ دی اور ڈیڑھ برس قید محض کی سزا کاٹی اس کے بعد پرائیوٹ طور پر انگریزی میں ایم، اے کیا اور اس میں اوّل رہے۔ کچھ دنوں تک لکھنؤ اور کان پور میں اُردو کے پروفیسر رہے۔ اب الٰہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے معلّم ہیں۔

فراق کے والد منشی گورکھ پرشاد عبرت۔ میر۔ غالب۔ حالی اور فارسی شعراء کے کلام سے متاثر تھے۔ لیکن ان کی صحبت میں شاعری کا کبھی ذکر نہیں رہا۔ البتہ ان کے پھوپھی زاد بھائی منشی راج کشور لال سحر نے انھیں امیر و داغ کے کلام سے روشناس کرایا۔ ۱۹۱۸ء کے بعد سے، فراق نے فارسی شعراء اور اُردو میں میر، غالب، آتش، حالی، عزیز، شاد یاس، حسرت کے کلام کا غائر نگاہ سے مطالعہ کیا اور درد دہلوی کی شاعری سے خاص طور پر متاثر ہوئے۔ چنانچہ ان کے جانشین فراق ہی کی تخلص پر اپنا تخلص رکھ لیا۔ ابتدا میں دو چار غزلیں ناصری مرحوم کو دکھلائیں لیکن ۱۹۲۳ء کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوگیا اور اس کے بعد اپنے طور پر غزلیں کہنا شروع کی فراق کم لکھتے ہیں اور دی ہوئی طرحوں کے بجائے

اپنی زمینوں میں زیادہ سہولت کے ساتھ کہتے ہیں۔ غزل کے بہت مدّاح ہیں اور مفکرانہ اور حقیقی غزل گوئی کو سماجی زندگی سے غیر متعلق نہیں سمجھتے۔

فراق کا تغزل دورِ حاضرہ کے میلانات کا مظہر ہے۔ ان کے کلام کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ حیات و کائنات کے نئے شعور و احساس اور انفرادیت اور آفاقیت کی ہم آہنگی کو غزل میں نمایاں جگہ دینا چاہتے ہیں۔

حیات بھی نہ ہو معراج آسمان و زمیں
مرا وجود بھی میرا وجود ہے کہ نہیں

جو بھولتی بھی نہیں یاد بھی نہیں آتیں
تری نگاہ نے کیوں وہ کہانیاں نہ کہیں

لبِ نگار رہیں یا تغمۂ بہار کی تہ
سکوتِ ناز ہے یا کوئی مطرب رنگیں

اگر بدل نہ دیا آدمی نے دنیا کو
تو جان لو کہ یہاں آدمی کی خیر نہیں

شروعِ زندگیٔ عشق کا وہ پہلا خواب
تھیں بھی بھول چکا ہے ہمیں بھی یاد نہیں

ہر انقلاب کے بعد آدمی سمجھتا ہے
کہ اس کے بعد نہ پھرے گی کروٹیں یہ زمیں

انھی فضاؤں میں تو انقلاب پلتا ہے
زمیں بھی بھری ہوئی سی فلک بھی چیں بہ جبیں

بس اک فسانۂ انداز عشق و شانِ جمال
بس ایک خوابِ پریشاں یہ شورش و تمکیں

ہر اک ابد کا مسافر ہر ایک خانہ بدوش
سیر دیارِ محبت کوئی مکان نہ مکیں

نگاہِ ناز تری کافری کو پا نہ سکے
ہزار قبلۂ ایماں ہزار کعبۂ دیں

وہ جس نے اہلِ محبت کے ہوش اڑائے تھے
نگاہِ ہوش رہا تھی نہ گیسوے مشکیں

ہزار شکر کہ مایوس کر دیا تو نے
یہ اور بات کہ تجھ سے بڑی امیدیں تھیں

جھپک جھپک سی گئی ہے بہار لالہ و گل
تری نگاہ سے چنگاریاں سی کچھ جو اڑیں

خدا کے سامنے میرے قصوروار ہیں جو
برابر ان سے نگاہیں مری نہیں ہوتیں

مزاجِ عشق کو لازم ہے اب بدل جانا
کہ کچھ دنوں سے تو سنتے ہیں حسن بھی ہے حزیں

ہنر تو خیر ہنر عیب سے بھی جلتے ہیں
فغاں، کہ اہلِ زمانہ ہیں کس قدر کم بیں

چمک کر حُسنِ عالم، عالمِ وحدت نہ ہو جائے
کہیں دُنیا کی ہر صورت تری صورت نہ ہو جائے

تری آنکھیں زمانے کے بدلنے کی کہانی ہیں
محبّت بھی انھی آنکھوں کی کیفیت نہ ہو جائے

بجائے خلد وعدہ رکھ بھروسا بچی دُنیا پر
مرا ذمہ جو دُنیا رشکِ جنت نہ ہو جائے

ہزاروں مشعلیں گُل کر چلا ہے وقت کا دامن
ترا یہ نورِ ایماں سربسر ظلمت نہ ہو جائے

محبّت میں بدلتا جا رہا ہوں پھر بھی ڈرتا ہوں
فراقؔ آغاز میں جو تھی وہی حالت نہ ہو جائے

آج بھی کام محبّت کے بہت نازک ہیں
دل وہی کارگہِ شیشہ گراں ہے کہ جو تھا

ظلمت و نور میں کچھ بھی نہ محبّت کو ملا
آج تک ایک دھندلکے کا سماں ہے کہ جو تھا

منزلیں گرد کی مانند اُڑی جاتی ہیں
وہی اندازِ جہانِ گذراں ہے کہ جو تھا

دیکھ سکنے کی الگ بات مگر حُسن ترا
دولتِ دیدۂ صاحب نظراں ہے کہ جو تھا

سوالات

۱۔ فراقؔ کی خصوصیات بیان کیجیے۔

۲۔ نیاز کو ان کے مستقبل کی طرف سے اندیشہ ہے۔ کیا یہ اندیشہ حق بہ جانب ہے؟

قصائد

قصیدہ

قصیدہ اصلاح میں اُن اشعار کو کہتے ہیں جن میں کسی کی تعریف یا مذمت کی جائے یا وعظ و نصیحت بہار کی تعریف یا زمانے کی شکایت وغیرہ کے مضمون نظم کیے جائیں بہ اعتبار مضمون یہ غزل سے بالکل جُدا چیز ہے۔ داخلی اور خارجی دونوں طرح کے مضمون قصیدے میں ہوتے ہیں۔ قصیدے کے لیے۔ الفاظ میں شکوہ، خیالات میں بلندی، مضامین میں نزاکت ہونا نہایت ضروری ہے۔ مگر ہر چیز میں فصاحت و بلاغت کو مدِ نظر رکھنا چاہیے۔

قصیدے کی تعداد اشعار کم سے کم سات اور بقول بعضے اُنیس [19] بیس [20] اور زیادہ سے زیادہ ستر [70] شعر تک قرار دی ہے۔ مگر اس کی پابندی نہیں کی گئی اور قصیدے میں دو دو سو شعر تک ریختہ گو اور فارسی کہنے والے شعرا کے یہاں پائے جاتے ہیں اور اہل عرب کے یہاں پانچ پانچ سو شعر تک موجود ہیں۔ مولوی غلام علی آزاد نے قصیدے کی حد اکیس [21] سے اکتیس [31] تک رکھی ہے۔ یہ بھی دستور ہے کہ قصیدے اپنی ردیف یا قافیہ کے آخری حرف سے مشہور ہوتے

ہیں چنانچہ آخر میں لام ہے تو قصیدۂ لامیہ ۔ میم ہے تو میمیہ کہا جائے گا۔ اور اسی طرح مدح و نام کا بھی اعتبار ہوتا ہے۔ اگر اس میں مدح ہے تو مدحیہ۔ اور فخر ہے تو فخریہ کہا جائے گا۔ قصیدے کے مضمون اور رتبے کے اعتبار سے شعرا نے قصیدوں کے نام بھی رکھے ہیں۔ اور یہ دستور عرب سے لے کر ریختہ یعنی اُردو تک جاری ہے۔

قصیدے کی ابتدا دو صورتوں سے کی جاتی ہے۔ یا یہ کہ مدح سے پہلے کچھ اشعار بہاریہ یا حُسن و عشق کے بیان۔ یا شکایت روزگار وغیرہ میں کہے جائیں۔ اس کو تمہید اور تشبیب اور نسیب بھی کہتے ہیں۔ اور ایسے قصیدے کو تمہیدیہ بھی کہتے ہیں جس جگہ کہ اس تمہید کو ختم کر کے اصل مقصد کی طرف رجوع ہو اُس کو گریز مخلص۔ تخلیص اور تخلّص کہا جاتا ہے۔ مدحیہ قصیدوں میں اکثر ممدوح کے لیے کچھ دعائیہ شعر بھی کہے جاتے ہیں ان کو دعائیہ کہتے ہیں اور اگر دعا کے ساتھ کچھ شرط ہو تو شرطیہ کہتے ہیں۔ جس قصیدے میں کئی مطلع ہوں تو اُسے ذوالمطالع کہتے ہیں۔ اور ایک قصیدہ میں موقع موقع سے کئی مطلع ہونا حُسنِ قصیدہ شمار کیا جاتا ہے۔

دوسری قسم قصیدہ خطابیہ ہے۔ جس میں ابتدا ہی سے اصل مطلب کی طرف رجوع ہو۔ ایسے قصیدے کو مجددیہ بھی کہتے ہیں۔ اور بعض نے اس کا نام مکابرہ رکھا ہے۔

قصیدے میں تین۳ چیزوں پر بہت زور دیا جاتا ہے اور یہی مقام

نازک خیال کیے جاتے ہیں۔ اوّل تشبیب کے اشعار۔ دوسرے جائے گریز جس میں یہ نہ معلوم ہو کہ مصنّف قصد کر رہا ہے کہ وہ اب اس مضمون کو چھوڑ کر دوسری طرف جاتا ہے بلکہ اُس میں ایک قسم کی بے تکلفی پائی جائے۔ تیسرے دُعا اور مقطع۔ بعض کہتے ہیں کہ حُسنِ طلب یا اُس مضمون کی جس کے لیے قصیدہ لکھا ہے عمدگی کی بھی بہت ضرورت ہے۔

اُردو میں مرزا رفیع سوداؔ۔ شیخ ابراہیم ذوقؔ منیرؔ شکوہ آبادی شہیدیؔ محسنؔ کاکوروی بہترین قصیدہ لکھنے والے گذرے ہیں اور بحیثیت مقبولیت وہ کافی شہرت رکھتے ہیں۔

مرزا رفیع سوداؔ

اقلیم شعر و سخن کے تاجدار مرزا رفیع سوداؔ کی ولادت ۱۱۳۵ھ میں شہر دہلی میں ہوئی اور ان کے والد مرزا محمد شفیع نے جو بسلسلۂ تجارت دہلی ہی میں بود و باش رکھتے تھے اپنے نام کے وزن پر بیٹے کا نام بھی محمد رفیع رکھا۔ مرزا نے یہیں وہ تعلیمی مراحل بھی طے کیے جو اُن کے زمانے کے تعلیم حاصل کرنے والوں کے واسطے ضروری اور لابدی تھے۔ اُردو تو اُن کی زبان ہی تھی۔ فارسی اور حسب ضرورت عربی میں لیاقت بہم پہونچائی۔ سِن شعور کو پہونچے تو سخن گوئی کا مادّہ جو قدرت نے اُن کو سونپ دیا تھا۔ جوش میں آیا۔ دلّی کے باکمالوں میں سے

سلیمان قلی خاں وداد کو انتخاب کر لیا اور فارسی کے شعر کہنے لگے اُس وقت اسی زبان میں کمال پہونچانا سرمایۂ نازش و افتخار تھا۔ اور پرانے لوگ اسی کو طغرائے امتیاز سمجھتے تھے۔ مرزا نے فارسی کی شاعری بہت کی۔ مگر خان آرزو جو اس دور کے باکمال اُستاد تھے ان کو ریختہ گوئی کی ترغیب دیتے رہے۔ اور بالآخر یہ اُردو کی طرف متوجہ ہو گئے۔ متوجہ ہوئے تو ایسے ہوئے کہ کامل و اکمل ہوئے اور دلّی کے ہر گلی کوچے میں انھیں کا نام سُنا جانے لگا۔ اُردو میں یہ شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے۔ اور حاتم کو ان کی شاگردی پر ناز ہوا۔ اور اس شہرت نے اتنا عروج پایا کہ فرمانروائے دہلی شاہ عالم بادشاہ بھی ان کے زُمرۂ تلامذہ میں داخل ہوئے۔ اور اُستاد شاہ ہونے کا انھیں فخر حاصل ہوا کہتے ہیں کہ یہ صحبت برآمد نہ ہوئی اور کسی بات پر نازک مزاج شاعر ایسا بگڑا کہ بادشاہ بُلاتے بُلاتے تھک گئے اور اس نے پھر کبھی دربار کا رُخ نہ کیا۔ مگر ایسے باکمال کے لئے دربار سے علیحدگی کچھ نقصان دہ ثابت نہ ہو سکتی تھی۔ دلّی کے قدردان اُمرا مہربان خاں دوست خاں وغیرہ کی دریا دلی نے ان کو اس کی خبر بھی نہ ہونے دی اور ان کی شہرت بڑھتی رہی۔

مرزا کی شہرت اور کمال فن کا زمانہ وہی تھا جب دلّی تباہی کے سیدے پایاں غار تک پہونچ چکی تھی بیرونی دشمنوں کے حریصانہ حملے تو درکنار۔ آپس کی مخالفت۔ خانہ جنگی۔ خود غرضی خود مطلبی نے آفت ڈھا رکھی تھی اور طوائف الملوکی کا بازار گرم ہو رہا تھا پشتہا پشت کے

سرمائے۔ بزرگوں کی دولتیں لٹ رہی تھیں۔ اطمینان مفقود۔ اور اندیشہ ہر وقت موجود تھا۔ قدیم رہنے والے سینے پر وطن کی مفارقت کا بھاری پتھر رکھ کر۔ وطن۔ اہل وطن۔ دوست۔ اقارب۔ املاک۔ مال متاع کو خیرباد اور الوداع کہہ کے غربت کی خاک اُڑانے جا رہے تھے۔ مرزا بیچارے بھی یہاں رہتے تو کیا کرتے اور کیا کھاتے مجبوراً تن بہ تقدیر چل کھڑے ہوئے۔ اور فرخ آباد میں نواب احمد خاں کے پاس ٹھہرتے ہوئے ۱۱۸۵ھ میں فیض آباد پہونچے۔ جہاں نواب شجاع الدولہ مسند آرائے حکومت تھے۔ اتفاق دیکھئے کہ ایک مرتبہ جب نواب نے ان کو برادر من مشفق من لکھ کر بلایا تھا تو یہ کہہ کر انھوں نے ٹال دیا تھا کہ ؎

آوارہ از یں کوچہ باں کو کب تک	سودائے دنیا تو بہر سو کب تک
بالفرض ہوا یہ بھی تو پھر تو کب تک	حاصل یہی اس سے نہ کہ دنیا ہووے

یا اب مصیبت نے بغیر بلائے وہیں پہونچا دیا۔ پھر بھی نواب نے ان کی قدر کی۔ اور یہ خوشی وہاں رہے۔ اگرچہ ایک مرتبہ نواب کا یہ کہنا کہ مرزا تمھاری وہ رباعی اب تک مجھے یاد ہے۔ ان کو بہت گراں گزرا۔ اور ہمیشہ یہ فقرہ تیر کی طرح کھٹکتا رہا۔

جب نواب آصف الدولہ کا دور آیا اور مرکز حکومت لکھنؤ ٹھہرا۔ تو بڑے بڑے اہل کمال دلّی کو چھوڑ کر یہیں آ پہونچے۔ اور یہ مجمع اچھا خاصہ ہو گیا۔ مرزا بھی فیض آباد سے آ کر لکھنؤ میں رہے اور درباری شعرا یا مصاحبین میں وابستہ ہو گئے یہیں ان کے مرزا فاخر مکین سے مباحثے اور مجادلے ہوئے جس کی تفصیل بڑے

تذکروں میں درج ہے۔

سوداؔ کی طبیعت ہمہ گیر۔ ہر رنگ پر قادر۔ ہر صنف سخن پر یکساں عبور رکھنے والی تھی۔ غزلیں۔ قصیدے۔ مثنویاں۔ ترجیع بند۔ مرثیے سلام۔ رباعیات۔ سبھی کچھ اُن کے کلام میں موجود ہیں۔ اور اپنی اپنی جگہ پر سب کا بڑا درجہ ہے۔ مگر دوسرے اصناف میں اُن کے اور حریف بھی ہیں جن کو اُن کے مقابلے پر لایا جا سکتا ہے۔ اور کوئی شک نہیں کہ مثنوی میں میر حسنؔ اور میر تقیؔ۔ غزلیات میں میرؔ و مصحفیؔ وغیرہ اُن کے زبردست مدمقابل بلکہ کچھ بڑھے ہوئے ہیں۔ البتہ قصیدوں میں کوئی اُن کا ثانی نہیں اور وہ اپنا آپ ہی جواب ہیں۔

سوداؔ کے قصیدوں کی تشبیب میں کمال عروج۔ روانی بیان تسلسل مضامین۔ علوِ الفاظ و خیال سبھی کچھ ہیں مگر افسوس ہے کہ ہجویات نے اُن میں کہیں کہیں بازاریت۔ اور بدگوئی نے بعض جگہ ابتذال کی صورت پیدا کر دی ہے جس کا یہ کہہ کر جواب دیا جا سکتا ہے کہ زبان ریختہ اس وقت اپنے ابتدائی دور سے گزر رہی تھی۔ اور اس وقت کے استاد ان باتوں کی کچھ پروا نہ کرتے تھے۔ ان کے یہاں تذکیر و تانیث کی پابندی۔ صحت تراکیب کا التزام۔ حدود ادب سے وابستگی کہیں کہیں جاتی رہتی ہے۔ اسی طرح سوداؔ بھی کبھی کبھی ان حدود سے دور ہو جاتے ہیں۔ سوداؔ نے ۱۱۹۵ھ میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔ ان کے قصائد میں سے دو قصیدے انتخاب کر کے ذیل

ہیں درج کیے جاتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قصیدہ در نعتِ حضرت سید المرسلین خاتم النبیین احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ سے زُنّار تسبیح سلیمانی

ہنر پیدا کر اوّل ترک کیجیو تب لباس اپنا
نہ ہو جوں تیغ بے جوہر وگرنہ ننگ عریانی

فراہم زر کا کرنا باعث اندوہ دل ہوئے
نہیں کچھ جمع سے غنچہ کو حاصل جز پریشانی

خوشامد کب کریں عالی طبیعت اہلِ دولت کی
نہ جھاڑے آستیں کہکشاں شاہوں کی پیشانی

عروج دستِ ہمت کو نہیں ہے قدرِ بخشش کم
سدا خورشید کی جاگت پہ ساوی ہو زر افشانی

کرے ہے کلفتِ ایام ضایع قدرِ مردوں کی
ہوئی جب تیغ زنگ آلودہ کم جاتی ہے پہچانی

اکیلا ہو کے رہ دنیا میں گر چاہے بہت جینا
ہوئی ہے فیضِ تنہائی سے عمرِ خضر طولانی

اذیت وصل میں غنی جدائی سے ہو عاشق کو
بہت رہتا ہے نالاں فصلِ گل میں مرغِ بستانی

موقر جان اربابِ ہنر کو بے لباسی میں
کہ ہو جو تیغ با جوہر اُسے عزت ہے عُریانی

بزرگ کو رہ خاموش حرفِ ناسزا سنکر
کہ تا بدگو صدائے غیب سے کھینچے پشیمانی

روشن ہے برنگِ شمع ربطِ باد و آتش سے
موافق گر نہ ہووے دوست ہے وہ دشمنِ جانی

نہیں غیر از ہوا کوئی ترقی بخشِ آتش کا
نفس جبتک ہے داغِ دل سے فرصت کیونکہ ہو پانی

کرے ہے دہر زینت ظالموں پر تیرہ روزی کو
کہ زیبِ ترکِ چشمِ یار سرمہ ہے صفاہانی

طلوعِ مہر ہو پامالِ حسرت آسماں اوپر
لکھوں گا پھر غزل گر اس زمیں میں مطلعِ ثانی

مطلع ثانی

عجب ناداں ہیں جنکو ہے عجب تاج سلطانی
فلک بال ہما کو پل میں سونپے ہے مگس رانی

نہیں معلوم اُن نے خاک میں کیا کیا ملا دیکھا
کہ چشم نقش پا سے تا عدم نکلی نہ حیرانی

ہماری آہ دل تیرا نہ نرماوے تو یا قسمت
دگرنہ دیکھ آئینہ کو پتھر ہو گئے پانی

تری زلفوں سے اپنی روسیاہی کہہ نہیں سکتا
کہ ہے جمعیت خاطر مجھے اُن کی پریشانی

زمانہ میں نہیں کھلتا ہے کاربستہ حیراں ہوں
گرہ غنچے کی کھولے ہے صبا کیونکر باسانی

جنوں کے ہاتھ سے سر تا قدم کاہیدہ اتنا ہوں
کہ اعضا دیدۂ زنجیر کی کرتے ہیں مژگانی

نہ رکھا جگ میں رسم دوستی اندوہ روزی نے
مگر زانو سے اب باقی رہا ہے ربط پیشانی

سیہ بختی میں اے سودا نہیں طول امل لازم
نمط خامہ کے سر کٹوائیگی ایسی زباں دانی

سمجھ اے نا قباحت فہم کبتک یہ بیاں ہوگا
ادائے چین پیشانی و لطف زلف طولانی

خدا کیواسطے باز آ تو اب ملنے سے خوباں کے
نہیں ہے اُنسے ہرگز فائدہ غیر از پشیمانی

نظر رکھنے سے حاصل اُنکے چشم و زلف کے اوپر
مگر بیمار ہووے صعب یا کھینچے پریشانی

نکال اس کفر کو دل سے کہ اب وہ وقت آیا ہے
برہمن کو صنم کرتا ہے تکلیف مسلمانی

نہ ہے دین محمدؐ پیروی میں اُس کے جو ہو دیں
وہ ہے خاک قدم سے اُسکی چشم عرش نورانی

ملک سجدہ نہ کرتے آدم خاکی کو گر اُس کی
امانت دار نور احمدی ہوتی نہ پیشانی

اُسی کو آدم و حوا کی خلقت سے کیا پیدا
مراد الفاظ سے معنی میں تا آیات قرآنی

خیال خلق اُس کا گر شفیع کافراں ہووے
رکھیں بخشش کی سر منت یہودی اور نصرانی

زباں پر اسکے گزرے حرف جیسا کہ شفاعت کا
کرے فی الحال تا آمرزش یہ ہر ایک فاسق و زانی

رکھا جب سے قدم مسند پر اُن نے شریعت کا
کرے ہے موج بحر معدلت تب سے یہ طغیانی

اگر نقصان پر خس کے شرر کا ٹک ارادہ ہو
گرہ کو آگ کے وہیں کرے غرق آ کر پانی

موافق گر نہ کرتا عدل اسکا آب و آتش کو — تو کوئی سنگ سے بندھتی تھی شکل لعل رمّانی

یہ کیا انصاف ہے یارو کہ طیر و وحش تک جگ میں — اس امن و عیش سے اپنی بسر اوقات لیجانی

پلے ہے آشیاں میں باز کے بچہ کبوتر کا — شباں نے گرگ کو گلہ کی سونپی ہے نگہبانی

ہما آسا ہے پرواز مگس اوج سعادت پہ — کرے ہے مور چڑھ کر سینہ دور سلیمانی

کھلے ہے غنچۂ گل باغ میں خاطر سے بلبل کے — جواب اوراق جمعیت کو ہوتی ہے پریشانی

جہاں انصاف سے سرگاہ اب معمور ہے اتنا — تو اسکے آگے ہوگی عدل کی کیا کچھ فراوانی

ہزار افسوس اے دل ہم نہ تھے اسوقت دنیا میں — وگرنہ کرتے یہ آنکھیں جمال اسکے سے نورانی

نہونے سے جدا سایہ کے اس قامت سے پیدا ہے — قیامت ہوویگا دیکھے وہ محبوب سبحانی

جسے یہ صورت و سیرت کرامت حق نے کی ہووے — بجا ہے کہیے ایسے کو اگر اب یوسف ثانی

معاذ اللہ یہ کیا حرف بیموقع ہوا سرزد — جو اسکو پھر کہوں تو ہوں میں مردود مسلمانی

کدھر اب فہم ناقص لے گیا مجکو نہ یہ سمجھا — کہ وہ مہر الوہیت ہے یہ ہے ماہ کنعانی

جو صورت اسکی ہے لاریب وہ ہے صورت ایزد — جو معنی اسکی ہیں بیشک وہ ہیں معنی ربانی

حدیث من رآنی دال ہے اس گفتگو اوپر — کہ دیکھا جسنے اسکو اُن نے دیکھی شکل یزدانی

غرض مشکل ہمیں ہوتی کہ پیدا کرکے ایسے کو — خدا گر یہ نہ فرماتا نہیں کوئی مرا ثانی

بس آگے مت چل اے سودا میں دیکھا فہم کو تیری
کر استغفار اس منہ سے اب ایسے کی ثنا خوانی

قصیدہ در مدح نواب سیف الدولہ احمد علیخاں بہادر پسر سید صلابت خاں

برج حمل میں بیٹھ کے خاور کا تاجدار — کھینچے ہے اب خزاں پہ صف لشکر بہار

کہتے ہیں یوں زبانی پیک صبا یہ حکم — پہونچا حضور سے طرف باغ روزگار

مرکب جو شاخسار کے ہیں اُنپہ اب شتاب
پہونچیں سوار ہو کے جوانان برگ و بار

ہیں بخشی دو وزیر جو مریخ و ماہتاب
انکو یہ امر ہے کہ امیران نامدار

مُنھ کھولدو خزانۂ گل اشرفی کے تم
پکڑو قلم کو ہاتھ رکھو پیادہ و سوار

چہرہ لکھا کے سرخ نگہداشت اب کرو
تعداد پوچھتے ہو تو بیحد و بے شمار

کردو یہ حکم پیر فلک کو کہ اے دبیر
ہووے محرّروں کا تغافل اگر شعار

اہل قلم جو دفتر بخشی گری کے ہیں
اُن سے کہیں برائے تقید یہ بار بار

گلگون لالہ گر کہیں بیداغ رہ گیا
چیریں گے پیٹ ہر متصدی کا غنچہ وار

لینا ہے کام مجکو جوانانِ باغ سے
بھر بھر سپر گلوں کے تکیں دو زر عیار

ابلاغ خاناماں کو ہووے اس امر کا
تا یہ کہے بلا کے وہ اپنے بھی پیشکار

معمول سے زیادہ مقیّد ہوں اکی سال
جسطرح چاہیے کریں اس فوج کا سنگار

پس اہلکار لالۂ خود رو سے یہ کہیں
رنگیں شتاب مستک فیلانِ کوہسار

دگلے ہزار رنگ کے پہنادیں ابر کو
موج ہوا تلک ہو زرہ پوش اکی بار

تقسیم کردیں فرقۂ غنچوں میں چلتہیں
دیں دو اپنے رسالۂ گل ہو امیدوار

کہدیں کہ چار نہر سے گلشن کے صحن باغ
چار آئینہ کو سج کے رہیں مستعد کار

باروُد گولی پیر مغاں میکدہ کے بیچ
رکھیں نہ اب سوائے کمر کیسہ زینہار

بندوقیں بدلے شیشوں کے بھر بھر کے منھ تلک
اگر شتاب صحن چمن میں کریں گزار

جلتے ہیں نے نواز جہاں بیچ اب کریں
پیشہ وہ کرنا سے بجانے کا اختیار

باور اگر نہیں تو اسے آن دیکھ لو
پایا ہے امر مطلع ترنے یہ اشتہار

ترکش لگا کے دینے کو نصیحۂ بہار
گلگوں یہ اپنے ترک ہزارا ہوا سوار

لازم ہے تجکو پی کے شراب طرب کا جام
گر مرد ہے تو سیر گلستاں کر اکی بار

یک گل زمیں نہیں کہ جہاں آب تیر سے
کرتا ہو وے کھینچ کے شمشیر آبدار

غصّے سے یکدگر کٹے مرتے ہیں یہ کہ موج
گرداب ڈھال رکھکے ہو مارے ہے جب کٹار

بن خود ایک دم نہیں رہتا سر حباب
ڈالے رہے ہے منھ پہ جھلم سنگ آبشار

اندام جو بُاد پراب عکس تاک سے
بکتر سجا ہی دیکھوں ہوں کیا لیس کیا نہار

جاتا ہے نیستاں کے جو دو یدگی یہ وہم
ہوتا ہے اس یقیں کا دل میں ذہیں گذار

نکلیں ہیں باندھ باندھ کمر ہو کے مستعد
لیکر پھرے ہے بانوں کے سر پہ سے نامدار

زنجک ہی بہر مشق اُڑایا کرے ہے برق
گولے ہی ڈھالتا ہے سحاب تگرگ بار

آواز توپ در ہلکہ و رعد روز و شب
کرتے ہیں یہ سپہر سے جا اسطرف گذار

گریار چہ بھی ابر سیہ کا ہوا میں ہے
گجنال کی طرح سے چنگھاڑے ہے بار بار

تھا جسقدر کہ سبزۂ خوابیدہ یہ سدا
سنکر زمیں سے چونک اٹھا ہو کے بیقرار

آسودگان خواب عدم بھی ہے عنقریب
اُٹھکر کے خاکدان سے کریں حشر آشکار

کرتے ہیں طائران چمن اب یہ زمزمہ
یارب یہ ابکی سال قیامت ہے یا بہار

طاؤس نام وہ جو ہیں اُس فوج کے نقیب
کرتے ہیں یہ صدا کہ جوانان لالہ زار

باہم سے دستہ دستہ جدے ہو کھڑے رہو
جلدی سے باندھ کر کمر کینہ استوار

میدان صاف کرتی ہے جاروب باد تند
تا وقت کار دامن گل سے نہ اُلجھے خار

صد برگ و جعفری و گل اشرفی نے اب
کیسر سے بانی کر کے یہ باہم کیا قرار

سنگھ صف قشون خزاں آوے جسگھڑی
ہو کر اُتارے کھیجیے میدان میں کارزار

استادہ ہے جہاں علف سبز خاک پر
پانی کی جسطرف کو زمیں پر چلے ہو دھار

بھالا ہے اور برچھی ہے بلم ہے اور سیل
خنجر ہے اور تیغ ہے دشنہ ہے اور کٹار

ہر آن میں ترانۂ بلبل کے واسطے
ہے اندنوں یہ شعر تجلی کا ردبکار

از سایہ ہائے بید مولہ ہر طرف
دار و زمین کمان سپہ تو دور کنار

ترک صبا سمجھے ہے مرا تیر باز گشت — ہو پشت پر حریف تو نکلے جگر سے پار

خالی سمجھ کے ہاتھ کو اپنے ہر ایک دم — مانگے ہے برگ بید سے خنجر کو ہر چنار

دامن کو باندھ باندھ ہوئے مستعد سپرد — قمری ہر ایک کہتی ہے یوں نعرہ مار مار

ایسا نہ ہو کہ طعن کریں ہم کو بلبلاں — اڑیو قدم کو گاڑ کے یاران طرحدار

نرگس کو باوجود ہے بیماری شدید — تسپر چمن میں آن کے وہ ناتوان زار

للکارتی ہے یہ کہ دو بہیاں ہو جو کوئی — ٹالے تو بارے آن کے سر سے عصا کا وار

کمرکھ کے ہر درخت سے یوں سنگترہ کا نخل — کہتا ہے گرچہ ہاتھ میں شیشہ ہے تیرے یار

لیکن تو دیکھیو کہ خدا وہ گھڑی کرے — کتنوں کا سر میں توڑوں گا پھر بھی مار مار

گولوں کے ہر درخت کو غصے نے اندنوں — کچھ آگ سی لگا دی ہے کیجیو تم اعتبار

دل میں غرض ہر ایک کے میں کیا بیاں کروں — پایا ہے آتش غضب و کیں نے یہ قرار

نکلیں بجائے دانہ شرر کچھ عجب نہیں — دیجیے اگر انار کو پنجہ میں لے فشار

القصہ آج پیک صبا سے یوں صبحدم — پوچھا کہ سن تو کس لیے خاور کا تاجدار

قتل خزاں پہ مستعد اتنا کہ جس لیے — کی جمع فوج قاہرہ اتنی کہ بے شمار

ایسا تو اس سے آج تلک کچھ نہیں ہوا — ہاں امر سلطنت کا نرالا ہے اختیار

یہ سنکے دیکھ دیکھ مرے منھ کو یوں کہا — سنتا ہے اے عزیز تو کافر کہ دیندار

دین نبی میں ہے تو ابھی باندھ کر کمر — گلدستہ کی طرح ہے تو ہو جا شریک کار

اب جرم کو خزاں کی جو پوچھے تو پیش خلق — بعد از یزید کے ہے خزاں ہی گناہگار

ٹک چشم منصفی سے تو اعمال اس کے دیکھ — کس کے لیے وہ گلشن دولت ہے اب وچار

نانا کو جسکے پوچھو تو راکب براق کا — دادا کو جو دیکھو مشرق و مغرب کا شہسوار

بدخواہ دولت ایسی کا ہووے جو کوئی شخص — اس پر نہ صف کشی کرے خاور کا تاجدار

آخر وہ اس گھرانے کا بندہ ہے زر خرید — پس کیوں نہ وہ کرے جسے اتنا ہو اقتدار

ایسا یہ خاندان ہے کہ نہ پشت سے فلک ۔ کرتا ہے جس جگہ کی غلامی کا افتخار

رکھے جہان کے داغ غلامی جبیں پہ ماہ ۔ ماہی کے دل میں جسکی اطاعت کا خار خار

اثبات تجھ پہ جرم نہیں اُس کا ابتلک ۔ اپنی تو اعتقاد ہے اتنی گناہگار

یکبار لعن گر کرے طوطی یزید پر ۔ بے اختیار ہوکے کرے اُسپہ صد ہزار

لیکن یہ دیکھیو کوئی دن کو بضرب کفش ۔ گلشن سے اُسکو کھینچ نکالے ہیں کرکے خوار

سُنکر غرض یہ پیک صبا سے میں یوں کہا ۔ ہے کون ملک بتا تو مجھے وہ بزرگوار

کہنے لگا کہ تجھ سے تعجب ہے یہ سخن ۔ اتنا تو ہوکے عاقل و دانا و ہوشیار

یہ رمز اب تلک نہیں سمجھا ہزار حیف ۔ ہے یہ وہ جسکے خوانِ کرم کا تو ریزہ خوار

یعنے وہ سیف نے ولے بہادر کہ جس کی تیغ ۔ کرتی رہی سدا سرِ اعدا پہ کارزار

جب میں سُنا زبان صبا سے یہ نام پاک ۔ وہ ہیں پڑھا یہ مطلع رنگین و آبدار

مطلع

دیوے نہ تیرے نام سے گلشن میں گر بہار ۔ پھولوں کو آب رنگ کا لینا ہو ناگوار

تیری سخا کے یاد سو افلاک پر نہال ۔ لاوے باغباں تو ثمر دے نہ شاخسار

ناخن بغیر غنچوں کے گانٹھیں نہ کھل سکیں ۔ تیری سخا جو یاد سحر کی نہو وے یار

میخانۂ جہاں میں کرم سے ترے نہیں ۔ کوئی شکستہ حال بجز توبہ و خمار

برسا ترا سحاب کرم یاں تئیں کہ اب ۔ ہوتا ہے رنگ آتش یاقوت آبدار

جو کچھ کہا میں اس کو خوشامد نہ بوجھیو ۔ یاں ارث ہے شجاع و سخی ہونیکا شعار

دادا ترے کا دست کرم کیا بیاں کروں ۔ سائل کو ناقے لوٹے کی اونٹوں کی دی قطار

رکھیو اب آگے مطلع تازہ پہ گوش جان ۔ خورشید کی ثنا کوئی کرتا ہے ذرہ وار

مطلع

موج گہر سپہر سے اودھر کرے گذار ۔ گر اپنے ابر فیض سے اتنا کرے بہار

اور اُسکے پوچھتے ہو شجاعت یہ سُن رکھو ۔ اژدر کی چیر سے تبر سے کہ جب تھا یہ شیرخوار

یکدم جو اُس کی تیغ کی بُرش ذرا سہو
دل میں اگر خیال کرے اپنے کوہسار

اجزاء ابجد ہیں جمادات کے بے سبب
پاجاویں جوں حواس پل میں انتشار

جس تو دے پر کہ تیر قضا کارگر نہو
خاکے کو اپنے آپ سے چھوڑے ہے وہ دوسار

تیری ہی تیغ و تیر کی دہشت ہے یاں تلک
تا وحش و طیر نے کی سلح پوشی اختیار

دراج کونسا ہے کہ پہنے نہیں زرہ
ہر ایک کرگدن کے بدن پر سپر ہیں چار

ارجن کے کمان کو تری دیکھ بھیم سے
اپنے تئیں تو کھینچتا ہے اُسکا سخت کار

جس سمت رُخ کرینگے تو میدان ہے وسیع
گر زندگی عزیز ہے بھیا تو کر فرار

روئیں تن اسکے آگے پس و پیش ہوں کھڑے
لے شرق تا بغرب اگر باندھ کر قطار

سوفار تیر بولی کہ سینہ پہ انگلی سے
پیکاں کو رکھکے جاوئیں پھلے کی پشت پار

دل میں مرے یقیں ہے کہ میدانمیں جس گھڑی
للکارے تو بلیوں کے تئیں کھینچ کر کٹار

گو بر کرے اس آن میں رستم کا گاؤ سر
بیت الخلا کو یاد کرے سام بار بار

مر مٹنے کا جو بہمن و برزو وغا کے روز
ہو جائیں تیرے سامنے آلیمیں کر قرار

پتلا زیادہ پانی سے ہو کر ترے حضور
ڈالے ہر ایک اپنی سپر کو حباب دار

ہو جسم سے علیحدہ پا دے سر پہ
نیزے پہ تیرے گر چمن رزم میں قرار

قمری ہر ایک بول اُٹھی یوں کہ ابکی سال
لایا ہے کسکے یمن قدم سے یہ سرو بار

یوں ہر عدو کے سینے میں اُسکو پرونے تو
جوں سیخ میں کباب کے ٹکوں کو بادہ خوار

وصف سپر تو کیا کروں اُسکا ہر ایک پھول
ہو جاوے روز رزم عدو کے گلے کا ہار

گلگوں ترے کی وصف میں کیا کیا بیاں کروں
گر دل اُسکے کھینچے جب گل رنگ حنا حصار

اُس حصر میں کرے ہے وہ اسطرح شوخیاں
تڑپے ہے جوں نسیم چمن میں ہو بیقرار

رانوں میں یہ سبک جو پھرے سطح آب پر
ٹوٹے حباب سُم تلے آکر نہ زینہار

مشرق کی سرزمین سے مغرب کی سمت کو
اُس برق وش کو پھینک دے گر ہو کے تو سوار

اس عرصے میں پھر آوے کہ شاید نہ بجھنے پاے
گر پھینکنے میں نعل سے اُسکی جھڑے شرار

پرہوں میں پیتروں کا عدو کے ترے غلام
میدانکے روز جسے جو ہو جائے وہ دوچار

ڈپٹے اُسے تو اُسپہ تو جاتا وہ یوں رہے
اُڑجائے باد تند کے آگے سے جوں غبار

رتبہ کی تیرے جاہ کی میں کیا بیاں کروں
جسکے تئیں نہ وہم فلک کہ سکے حصار

ہوتا نہ رنگ اطلس گردوں جو ماتمی
خیمہ کے استرونکو ترے تھا یہ جامہ وار

شہتیر کہکشاں کے تئیں بھی برائے چوب
دو کرتے چیر کر تو نہ بنتی وہ استوار

تھے مہر و مہ بھی خوب ہی کچھ بادریسہ کو
پرمندرس ہیں برسوں کے اتنے کہ بیشمار

لیکن مگر خطوط شعاعی کو اُس میں سے
بٹوائیے طنابیں سو کتنا یہ پود و تار

سرکار عالم فلکی میں تو کچھ نہیں
میخوں کیواسطے ہیں زمیں پر یہ کوہسار

قالی کا اُسکے فرش کا اتنا ہے عرض و طول
صد فصل گل نہ ہو سکیں جسکے نمونہ دار

جلتا ہے سطح روے زمیں اُسپہ گر اُسے
جس فصل میں بچھاؤ تو ہے موسم بہار

جس آن تو قدم رکھے اُس پر برائے جشن
کھلجائے دیکھتے ہی تجھے چشم روزگار

اور ہوویگا بھی یوں ہی تو خاطر کو جمع رکھ
صدقے سے پنجتن کے بتائید کردگار

سودا کرے ہے عرض کہ تیرے خزانہ سے
بھر بھر سپر ہی لینا ہے مجکو زرعیار

بالفعل اس قصیدے کا مانگے ہے یہ صلا
اُسکے تئیں خطاب ہو رزمیہ بہار

کیسے میں دوستوں کے ترے شکل ماہ و مہر
ہو سیم و زر ہر آن میں کیا لیل کیا نہار

ہاتھی کے ساتھ ساتھ یہ کہتا چلے عدو
مفلس ہوں کچھ دلا مجھے نواب نامدار

سوالات

(۱) سودا نے ادب اُردو پر کیا احسانات کیے ؟

(۲) "سودا نے ادب اُردو میں اہم اضافے کیے" اس مسئلہ پر بحث کیجئے۔

(۳) سودا نے زبان اُردو کی صفائی میں کامیاب کوشش کی۔ اُردو زبان کی اصلاح کب سے شروع ہوئی اور کون کون لوگ اس کام میں ممتاز رہے؟

(۴) سودا کی تحریر کی کیا خصوصیات ہیں؟

(۵) "سودا کا ادب اُردو اُسی قدر بلند مرتبہ ہے جتنا غالب یا انیس کا" بحث کیجئے۔

شیخ محمد ابراہیم ذوق

نام محمد ابراہیم۔ تخلص ذوق۔ دلّی کے قدیم باشندے۔ شیخ محمد رمضان کے بیٹے تھے۔ ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۰۴ھ کو دلّی ہی میں پیدا ہوئے۔ باپ نہایت غریب سپاہی پیشہ آدمی تھے اور نواب لطف علی خاں کے یہاں حرم سرا کے کام انجام دیتے تھے۔ جب یہ ذرا سیانے ہوئے تو حافظ غلام رسول کے پاس " جو ایک قدیم وضع کے بزرگ کلام اللہ شریف کے حافظ اور ایک مسجد کے امام تھے اور وہیں محلّے کے بچّوں کو تعلیم بھی دیتے تھے " تعلیم و تربیت کے لیے بٹھادیا۔ وہیں یہ پڑھتے بھی رہے۔ اور شعر و سخن کے وہ جلسے وہ اصلاحوں کے طور طریقے بھی دیکھتے رہے جو اُستاد کے یہاں رہتے تھے۔ شعر سُنتے تو شعر کہنے کی خود بھی آرزو ہوتی۔ تا اینکہ فیض صحبت نے اثر کیا۔ اور خود بھی کچھ موزوں کرنے لگے۔ کہیں ان کے ہم سبق ساتھیوں میں ایک شخص کاظم حسین بیقرار تھے ان کو بھی شاعری کا چسکا تھا معلوم انہیں کہ

حافظ صاحب اُن کے شاعری کے بھی اُستاد تھے بہر حال وہ جو کچھ کہتے تھے۔ اُن کو سُناتے ضرور تھے۔ ایک روز کوئی غزل کہہ کر لائے۔ حافظ صاحب کو سُنائی۔ اُنھوں نے جی بڑھایا اور اُس وقت کے مشہور اُستاد میاں شاہ نصیر کے شاگرد ہوئے۔ اس کا ذکر ذوق مرحوم سے بھی کیا۔ اُنھوں نے بھی خواہش کی اور اُنھیں کے ذریعہ سے یہ بھی شاہ صاحب کی خدمت میں پہونچ گئے۔

ذوق مرحوم کا شوق بڑھا ہوا تھا۔ روز غزلیں کہتے تھے اور اُستاد کو دکھاتے تھے۔ ایک دن کہیں سودا کی غزل پر غزل کہہ کرلے گئے اُستاد کی خدمت میں پیش کی۔ شاہ نصیر دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گئے اور بولے۔ اب تم اتنے بڑھے کہ اُستادوں کے منھ آنے لگے۔ جاؤ ہم اصلاح نہیں دیں گے۔ یہ بیچارے مایوس چلے آئے۔ سُنا ہے اُسی دن مشاعرہ تھا۔ گھومتے پھرتے جامع مسجد میں آئے۔ تو یہاں ایک بزرگ میر کلو حقیر نے انھیں افسردہ دیکھ کر سبب پوچھا۔ اُنھوں نے بتایا۔ اُن بیچارے کو رحم آیا۔ غزل سُنی کوئی سقم نہ تھا۔ کہا جاؤ غزل اچھی ہے۔ یوں ہی پڑھ دو۔ کوئی اعتراض کرے تو ہم ذمہ دار ہیں۔ یہ گئے۔ اور یوں ہی غزل پڑھی۔ رسمی واہ واہ ہوئی۔ ان کا جی بڑھا۔ اور اس دن سے یوں ہی بے اصلاحی غزلیں پڑھا کیے۔ اور شدہ شدہ مشہور ہو گئے۔ پھر میر کاظم حسین بیقرار کی وساطت سے قلعہ کے مشاعرے تک بھی رسائی ہو گئی۔ بیقرار ابو ظفر بہادر شاہ ولی عہد کے ملازم تھے۔ اور ولی عہد شعر و شاعری کے دلدادہ تھے۔ اس لیے ہمیشہ صحبت مشاعرہ گرم

رہتی۔ اور شہر کے باکمال شعرا کا قلعہ میں مجمع رہتا تھا۔ اس زمانے میں ظفر شاہ نصیر مرحوم سے اصلاح لیتے تھے۔ اتفاق سے شاہ نصیر مرحوم حیدرآباد چلے گئے۔ اور کاظم حسین بیقرار میر منشی کی خدمت پر شکارپور سندھ کی طرف چلے گئے۔ کچھ دنوں کے بعد ایک دن ولی عہد نے اپنی غزل ذوق مرحوم کو دی کہ ذرا اسے بنا دو اُنھوں نے دم کے دم میں غزل درست کر دی۔ بادشاہ بہت خوش ہوئے۔ اور اُسی وقت حکم دے دیا کہ کبھی کبھی آکر ہماری غزل بنا جایا کرو۔ چنانچہ اُس وقت سے یہ ولی عہد کی غزلوں پر برابر اصلاح دیتے رہے۔

اُنھوں نے ایک مرتبہ یہ قصیدہ ــ جبکہ سرطان واسد مہر کا ٹھہرا مسکن۔ بادشاہ کی تعریف میں کہہ کر سُنایا اکبر شاہ ثانی بادشاہ ان سے ایسے خوش ہوئے کہ خاقانی ہند کا خطاب دے دیا۔ اس وقت اُن کی عمر ۱۹ برس کی تھی۔ جب ابوظفر متخلص بہ ظفر سریر آرائے سلطنت ہوئے تو اُنھوں نے ایک قصیدہ کہہ کر گزرانا۔ انھوں نے ان کی تنخواہ میں بہت اضافہ کر دیا۔ اسی طرح ایک قصیدہ کے صلے میں ایک ہاتھی مرحمت ہوا۔ اور خان بہادری کا خطاب بھی دیا۔ ایک قصیدے کے انعام میں ایک گاؤں ملا۔ اور یہ مرفہ الحالی سے اوقات گزار کر ۲۴ صفر سنہ ۱۲۷۱ھ کو جہان فانی سے رخصت ہوئے۔ مرض الموت میں کل ۲۷ دن بیمار رہے۔

ذوق مرحوم کی سب سے بڑی خصوصیت اور سب سے اعلیٰ جاذبیت یہ ہے کہ جب سے اُردو زبان میں شاعری کا نشو و نما ہوا

ذوق کی برابر کوئی محاورہ بند۔ ضرب الامثال کو صحیح طور پر استعمال کرنے والا شاعر ان کے زمانے تک پیدا نہیں ہوا ان کی غزلوں میں زبان نہایت سادہ ہے۔ اور اسی زبان میں بہت سے بلند خیالیوں اور تصوّف و اخلاق کے مسائل کو بھی نظم کر دیا ہے دوسرا جوہر کلام کی ہمواری اور یکسانی ہے۔ جس روش پر ابتدا سے چلے ہیں اُسی کو آخر تک نباہا ہے۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ سودا کے بعد ذوق کے برابر بلند آہنگی کے ساتھ کسی نے قصیدہ نہیں کہا۔ کلام میں آمد کا زور۔ معلومات کی فراوانی الفاظ علمیہ کا برمحل صرف۔ محاورات کا استعمال۔ اظہار مطالب پر اتنی قدرت ان کے کسی معاصر کے یہاں نہیں۔

ان کے معاصرین میں صہبائی۔ ممنون۔ آزردہ۔ شیفتہ۔ مومن غالب سب لوگ شامل ہیں مگر جن کو بڑا حریف تسلیم کیا گیا ہے وہ صرف مرزا غالب ہیں۔ اور کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے انداز بیان میں سب سے علحدہ ہیں۔ مگر ایسی زبان۔ اور زبان پر ایسی قدرت ان کے یہاں نہیں۔ فارسی کے قصیدوں سے بحث نہیں اُردو میں ایسے پر زور قصیدے اُن کے یہاں نہیں پائے جاتے۔

ان کی اور مرزا کی نوک جھوک کے بہت سے قصّے سُنے جاتے ہیں۔ جن میں بڑا واقعہ اُس سہرے کا ہے جب مرزا اور ذوق مرحوم نے مرزا جواں بخت کی شادی کے موقع پر سہرے کہے ہیں۔ مرزا نے زینت محل کے ایما سے سہرا کہہ کر بادشاہ کی

نذر کیا مقطع یہ تھا۔

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

بادشاہ نے یہ مقطع پڑھا تو ذرا گراں گزرا۔ ذوق مرحوم کو حکم دیا کہ اُستاد آپ بھی سہرا کہیے اور مقطع پر نظر رکھیے۔ اُنھوں نے بھی زور دے کر کہا۔ اور مقطع میں مقطع کی طرف اشارہ کیا۔

جسکو دعویٰ ہو سخن کا یہ سُنا دے اُس کو
دیکھو اسطرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

مرزا اس سے سمجھ گئے کہ رنگ بدل گیا۔ اور کچھ کا کچھ ہو گیا۔ معذرت کے لیے ایک قطعہ کہا جس کا پہلا شعر یہ ہے

منظور ہے گزارش احوال واقعی
اپنا بیان حُسنِ طبیعت نہیں مجھے

اس کے بعد قصہ رفع دفع ہو گیا۔ مگر اندازہ کرنے والے آج تک کہتے ہیں کہ دونوں کے سہرے میں ترجیح کسی کو نہیں دی جا سکتی۔ ذوق کی سادگی۔ انداز بیان کی استواری۔ غالب کی پختہ کاوی تغزل کی شان۔ مضمون آفرینی آڑے آجاتی ہے۔ اور فیصلہ کرنے والا حیران رہ جاتا ہے۔

ذوق مرحوم کا کلام بہت تھا جو ضائع ہو گیا۔ پرگوئی اور محاورات کے شوق نے اُنھیں کہیں کہیں جادۂ اعتدال سے خارج کر دیا ہے۔ اور اکثر ایسے شعر بھی کہلا دیے ہیں جو اُن کی شان کے خلاف ہیں۔ ان کے قصیدوں میں بعض قصیدے درج ذیل کیے جاتے ہیں۔

قصیدہ تمہیدیہ

ہیں مرے آبلۂ دل کے تماشا گوہر
اک گہر ٹوٹے تو ہوں کتنے ہی پیدا گوہر

نظرِ خلق سے چھپ سکتے نہیں اہلِ صفا — تہِ دریا سے بھی جا ڈھونڈھ نکالا گوہر
رزق تو درخورِ خواہش ہے پہنچتا سب کو — مُرغ کو دانہ ملا ہنس نے پایا گوہر
پاک دنیا سے ہیں دنیا میں ہیں گو پاک سرشت — غرق ہے آب میں پر تر نہیں اصلا گوہر
کورِ باطن کو ہو کیا جوہرِ دانش کی شناخت — کہ پرکھتا نہیں جز دیدۂ بینا گوہر
جوہرِ خوب کو درکار ہے آرائشِ خوب — خوب تو آب کی خوبی سے ہے ٹھیرا گوہر
ربط ناچیز سے کرتے ہیں کوئی پاک نہاد؟ — ہو نہ ہمصحبتِ نارِ رگِ خارا گوہر
دلخراش اور ہے طاقت دہِ دل ہے کچھ اور — کہ نہ گوہر کبھی ہیرا ہو نہ ہیرا گوہر
صدق اور کذب پہ پرکھنے کے ہے شرطِ نظر — کور کیا جانے یہ سچا ہے کہ جھوٹا گوہر
صافِ باطن کی ہو جب قدر کہ ظاہر ہو درست — مول بھی ٹوٹ گیا صاف جو ٹوٹا گوہر
ہوتی غربت میں اگر قدر نہ خوش جوہر کی — تو کبھی کان سے باہر نہ نکلتا گوہر
ذوق موقوف کر اندازِ غزل خوانی کو (گریز) — ڈھونڈھ اس بحر میں اب تو کوئی اچھا گوہر
غوطہ دریائے سخن میں ہے لگانا بہتر — آگے تقدیر سے خر مُہرہ ملے یا گوہر
اثرِ مدح سے اس خسروِ دریا دل کے — کر سخن قابلِ گوشِ دلِ دانا گوہر
وہ بہادر شہِ غازی کہ بہ رنگِ نیساں — (مدح) روز برسائے ہے ابرِ کرم اُس کا گوہر
جشن سے اسکے ہے اک فیض کا در جاری — بہتے پھرتے ہیں بہ رنگِ کفِ دریا گوہر
پہنچے گر گوشِ صدف تک یہ نویدِ عشرت — اتنا بالیدہ بخود ہو کہ ہو مینا گوہر
مدحِ حاضر میں کروں کوئی مطلعِ تحریر — آج ہے خامہ مرا مُنھ سے اُگلتا گوہر

آج وہ دن ہے کہ اے خسروِ والا گوہر
کو دے نذر تجھے لعل تو دریا گوہر

بحر و بر میں ہیں شہا تیرے مہیائے نثار — سیم سے زر تلک اور لعل سے لے تا گوہر
مشتری کہتے ہیں جس کو وہ اُٹھا لایا چرخ — ٹوٹ کر جو تری ٹھوکر سے گرا تھا گوہر

صبح اقبال وسعادت کا ستارہ چمکا
جو ترا طرۂ دستار کا چمکا گوہر

ماہ کہنے کیلیے ہے نہ کہ گہنے کے لیے
تیرے گہنے کا کہوں کیا اُسے بڑھیا گوہر

درفشانی سے تری اتنے گہر ہیں ارزاں
لکھتے ہیں نسخۂ مفلس میں اطبا گوہر

(قطعہ) عکس سے نیرِ اقبال کے دریا میں ترے
اے محیطِ کرم وجود کے یکتا گوہر

(موتی) آب گوہر ہو تہ آب یہ اعجاز نما
کفِ دریا کو بنائے یدِ بیضا گوہر

کوہ کا زہرہ کرے آب تری ہیبتِ عدل
گر یہ سُن پائے کہیں سنگ نے توڑا گوہر

آب دریائے کرم سے جو ہو تیرے سیراب
ابرِ مردہ سے برسنے لگیں کیا کیا گوہر

سینہ صافی کا ترے ایک ہے نقشہ دریا
دلِ روشن کا ترے ایک نمونا گوہر

(خاتمہ) ذوق کرتا ہے دعائیہ پر اب ختم سخن
تا کہ ہو سنگ سے لعل آب سے پیدا گوہر

تار ہے پنجۂ خورشید میں ہر روز طلا
تا گرہ میں رکھے سب عقدِ ثریا گوہر

دانۂ انجم گردوں سے پروئے جب تک
رشتۂ کاہکشاں میں شبِ یلدا (تاریک رات) گوہر

جب تلک جوشِ بہاراں سے ہو لے دمِ صبح
ٹانکے شبنم سے سرِ دامنِ صحرا گوہر

ہر برس جشن ترا تجکو مبارک ہووے
برسیں نیسانِ کرم سے ترے شاہا گوہر

دوستوں کو ہو ترے گنجِ گہر روز نصیب
ہو نہ جز اشک سرِ دامنِ اعدا گوہر

قطعہ در تہنیت جشنِ نوروز

خسروا سُن کے ترا مژدۂ جشنِ نوروز
آج ہے بلبلِ تصویر تلک زمزمہ سنج

خبرِ عیش تری دی ہے چمن کو جا کر
زرِ گل پیکِ صبا پائے نہ کیونکر پارنج

بادۂ جوش جوانی کی ہے گویا اک موج
تنِ پیرانِ کہن سال پہ ہر چینِ شکنج

چند قطرہ سے ہیں شبنم کے وہ بلکہ کمتر
آگئے ہمت کے ترے گوہرِ شہوار کے گنج

حسنِ نیت سے ہے تو یوسفِ مصرِ بخشش
دستِ حاتم میں بجا ہو کہ جو دیکھا تیغ و ترنج

شش جہت پر ہو جو غالب ترا سر پنجۂ امن
فتنہ کو اُٹھنے میں جوں مُہرۂ کیا گیا ششدر پنج

نہ بجھے آب سے آتش نہ خس آتش سے جلے
ایک سے ایک موافق کہ مرنجان و مرنج

تیرے منصوبے کے تابع ہیں سب احکام نجوم
صفحہ تقویم کا گویا ہے بساط شطرنج

لایا ہوں معنی رنگیں سے یہ لعل خوش رنگ
ذوق جو مدح و ثنا میں ہو ترے گوہر سنج

خسروا ہوتا ہو اس رنگ سے معلوم یہ رنگ
رنگ نوروز جو ہے اب کے برنگ نارنج

بزم رنگیں میں تری رنگ طرب ہو ہر روز
اور تری خاطر اقدس پہ کبھی آئے نہ رنج

زہے نشاط اگر کیجیے اسے تحریر
عیاں ہو خامہ سے تحریر نغمہ جائے صریر

زباں سے ذکر اگر چھیڑیے تو پیدا ہو
نفس کے تار سے آواز خوشتر از بم و زیر

ہوا یہ باغ جہاں میں شگفتگی کا جوش
کلید قفل دل تنگ و خاطر دل گیر

کرے ہے وا لب غنچہ در ہزار سخن
چمن میں موج تبسم کی کھول کر زنجیر

کچھ انبساط ہوائے چمن سے دور نہیں
جو وا ہو غنچۂ منقار بلبل تصویر

قفس میں بیضہ کے بھی شوق نغمہ سنجی سے
عجب نہیں کہ ہو مرغ چمن نبالہ صفیر

اثر سے باد بہاری کے لہلہاتے ہیں
زمیں پہ ہمسر سنبل ہے موج نقش حصیر

نکل کے سنگ سے گر ہو شرارہ تخم فشاں
تو سبز فیض ہوا سے ہو وہ برنگ شعیر

زمیں پہ گرتے ہی لے آئے دانہ برگ و ثمر
جو ٹوٹے ہاتھ سے زاہد کے سبحۂ تزویر

ہوا پہ دوڑتا ہے اسطرح سے ابر سیاہ
کہ جیسے جائے کوئی پیل مست بے زنجیر

نہ خار دشت سے نرمی میں خواب مخمل ہے
ہر ایک تار رگ سنگ بھی ہے تار حریر

ہوا میں ہو یہ طراوت کہ دود گلخن بھی
برستا اُٹھتا ہے آتش سے مثل ابر مطیر

یہ آیا جوش میں باران رحمت باری
کہ سنگ سنگ میں سنگ یمہ کی ہو تاثیر

ہر ایک خار ہو گل ہر گل ایک ساغر عیش
ہر ایک دشت چمن ہر چمن بہشت نظیر

ہر ایک قطرۂ شبنم گہر کی طرح خوش آب ‏— ہر اک گہر گہر شب چراغ پر تنویر

کرے ہے صبح شکر خندہ اس غرض کے ساتھ ‏— کہ جسطرح ہم آمیختہ ہوں شکر و شیر

سنوارتی ہے جو شام اپنی زلف مشکیں کو ‏— سواد مشک ختن پر ہے لاکھ آہو گیر

نہال شمع سے ہر شب چنے گل شبو ‏— بہار عیش میں کلیوں کی طرح سے گلگیر

ہنسے چراغ تو ایسی ہنسی میں پھول جھڑیں ‏— حیا سے رنگ گل آفتاب ہو تغیر

رہے ہو چرخ پہ ہر صبح جوں صبوحی کش ‏— بایں درازی ریش آفتاب ساغر گیر

عجب نہیں ہے کہ آرائش زمانہ سے ‏— حنائی پنجہ ہوں تاک و چنار و بید انجیر

چمن میں ہے یہ درختان سبز پر جوبن ‏— کہ زہر کھاتے ہیں سبزان خطۂ کشمیر

نہ کیونکہ دیکھ کے گلشن کو یہ پڑھوں مطلع ‏— کہ آتی ہو نظر اک قدرت خدائے قدیر

ظہور نرگس و گل جلوۂ سمیع و بصیر (مطلع) ‏— نسیم نکہت گل اطہر و لطیف و خبیر

شمیم عیش سے ہے یہ زمانہ عطر آگیں ‏— کہ قرص عنبر اگر ہے زمیں تو گرد عبیر

حمل سے حوت تلک جابجا ہیں تصویریں ‏— بنا ہے عالم بالا بھی عالم تصویر

جہات ستہ سے بزم جہاں ہو عشرت خواہ ‏— کہ ہے ہجوم نشاط و سرور جم غفیر

زمانہ دشمن عشرت کا اس قدر قائل ‏— مہ صیام کو دیکھے نہ کوئی بے شمشیر

ہوا ہے مدرسہ یہ بزمگاہ عیش و نشاط ‏— کہ شمس بازغہ کی جا پڑھے ہیں بدر منیر

اگر پیالہ ہے صغریٰ تو ہے سبو کبریٰ ‏— نتیجہ یہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر و کبیر

زمین میکدہ یہ خندۂ نشاط انگیز ‏— کہ لائے مے سے ہو دیوار قہقہہ تعمیر

دیا ہے رنج کو دھو تیرے غسل صحت نے ‏— ضمیر خلق سے اسے بادشاہ پاک ضمیر

عجب نہیں یہ ہوا ہے کہ مثل نبض صحیح ‏— کرے اگر حرکت موج چشمۂ تصویر

شہنشاہا ترے یمن شفائے کامل سے ‏— جو لاعلاج مرض تھے وہ ہیں علاج پذیر

کہ چوب گل کو اگر ماریں بید مجنوں پر ‏— ق ‏— تو صورت بشر ہو شمند خوش تقریر

اشارہ فہم ہوا ایسا کہ وہ بیاں کرے — زبان برگ سے گونگے کے خواب کی تعبیر

پہ میل کحل بصارت ہو کلک خط غبار — تو چشم دائرۂ عین بھی ہو چشم بصیر

نہ موج مے کو ہو پیچش نہ شیشے کو ہچکی — گئی جہان سے یہ بیماری فواق و زحیر

نہ برق کو تپ و لرزہ نہ ابر کو ہو زکام — نہ آب میں ہو رطوبت نہ خاک میں تبخیر

بدل گئی ہے حلاوت سے تلخی دارو — شراب تلخ بھی ہو میکشوں کو شکر و شیر

قوی ہے قوت تاثیر سے دوائے طبیب — غنی قبول کی دولت سے ہے دعائے فقیر

شکست دل کو ترے یمن تندرستی سے — ق — کرے درست اگر مومیائی تدبیر

تو موئے کاسۂ چینی کو چارہ ساز قضا — نکالے کاسۂ چینی سے مثل موئے خمیر

کھجائے سر جو کبھی مفسدان سرکش کا — علاج خارش سر ہو بناخن شمشیر

بنا ہے نقش شفا خانۂ ہزار شفا — ہر ایک خانۂ تعویذ صاحب تکسیر

ہر ایک اسم عزیمت میں اسم اعظم ہے — ہر ایک نسخہ شفا میں ہے نسخۂ اکسیر

رہا نہ کوئی گرفتار رنج عالم میں — چھٹے جو تیرے تصدق میں مجرمان اسیر

شہا ہے دم سے ترے زندگانی عالم — یہ تیرا دم ہے وہ اعجاز عیسوی تاثیر

مثال خضر تو اے رہنمائے ملت و دیں — جہاں میں پیر ہو پر ہو کرامتوں سے پیر

تو وہ ہے حامی دنیا و دیں زمانہ میں — کہ تجھ سے زیب ہے دنیا کو دین کو توقیر

کیا شہان سلف نے مسخر ایک جہاں — کیے ہیں تو نے شہنشاہ دو جہاں تسخیر

سحر سے شام تلک زر فشاں ہے پنجۂ مہر — نثار کرتا ہے ہر روز ایک گنج خطیر

فلک پہ کرتا ہے ہر شب ادا جو سجدۂ شکر — نشان سجدہ ہے زیب جبین ماہ منیر

یہ روز بہ سے ترے ہیں جواں جہاں کہن — گھٹے نہ کوئی دو شنبہ کو بھی جہاں میں پیر

حیات بخش جہاں ہا تیرا مژدۂ صحت — جو بخشے خلق کو عمر طویل و عیش کثیر

ہزاروں سال سر ہر صدی نکال کے دانت — ہنسیں اجل پہ جوانوں کی طرح مردم پیر

جہاں کو یوں تری صحت کے ساتھ صحت ہے | صحیح جیسے کہ قرآں ہو مع تفسیر

یہ وہ خوشی ہے کہ فربہ ہوں جس کے روز بروز | ہلال بست و نہم کی طرح بدن کے حقیر

پڑھوں ثنا میں تری اب وہ مطلع روشن | کہ جسکا مطلع خورشید بھی نہ ہووے نظیر

شہنشاہ وہ تری روشنی راے منیر | (مطلع) عقول عشرہ کے انوار جس کے عشر عشیر

جو ہو نہ تابع امر تَشَاوَرْ ہُمْ فِی الْاَمْرِ | تو عقل کل کو کرے تو نہ ہرگز اپنا مشیر

جو ہیں نکات و معانی بشر کے فہم سے دور | وہ تیرے ذہن میں موجود سب قلیل و کثیر

اگر ہے سہو کو کچھ دخل حافظہ میں تو یہ | نہ اپنا یاد ہے احساں نہ اور کی تقصیر

حیا ہے گر متعلق تری نگاہ کے ساتھ | تو ہے ضمیر کی جانب تری صفا کی ضمیر

ترا تو سینہ بھی یوں ہے دخیل حسنات | کہ جیسے صحبت اصحاب کہف میں قطمیر

کرے ہے سلب تغیر کو ذات حادث سے | زمانہ عدل سے تیرے بہ اعتدال پذیر

مجال کیا کہ ترے عہد میں شرر کی طرح | اُٹھائیں سر کو شرارت سے سرکشان شریر

ہوا میں آگے جو کرتا ہے سرکشی شعلہ | تو چٹکیاں دل آتش میں لے ہے آتشگیر

ترے نسق سے جو بالکل رہی نہ خونریزی | لڑائیوں میں کہیں چھوٹتی نہیں نکسیر

جو پہونچے بتکدہ میں تیرا شور دینداری | بلند نالۂ ناقوس سے بھی ہو تکبیر

کیا یہ کفر کو اسلام نے ترے معدوم | کہ کوئی زلف بتاں پر نہ کر سکے تکفیر

جہاں میں چشم سیہ مست یار کا ہو یہ رنگ | جو میکشوں کو ترا احتساب دے تعزیر

پڑے گلے میں رسن خط سرمہ سے اُسکی | رہے مدام وہ گردش میں از پئے تشہیر

وہ برق قہر خدا تیری تیغ آتش دم | کہ جس کی آنچ ترے دشمنوں کو نار سعیر

جو ہو خدنگ کا تیرے نشانہ چشم حسود | تو ہے تفنگ کا تیرے دل عدو نخچیر

ترے نہیب سے ہوں شکل فلس ماہی الگ | کریں نہ حلقۂ جوہر رفاقت شمشیر

جو تیر نکلے کماں سے تری وہ ہو جاوے | طلب میں جان عدو کی رواں قضا کا سفیر

ترے ہی خامۂ طغرا نگار میں یہ زور
ق جو کھینچے ایک روش خط منحنی وہ لکیر

تو اُس سے ایسی ہوں اشکال ہندسی پیدا
مٹا دے دیکھ کے اقلیدس اپنی سب تحریر

وہ روشنی ترے خط میں کہ ابن مقلہ اگر
ق لگائے آنکھوں سے سرمہ کی جا تری تحریر

تو ہو یہ نور بصارت کہ پڑھ لے حرف بحرف
جو ہووے لوح جبیں پر نوشتہ تقدیر

رقم میں گر ترے اوصاف کے تصور کرے
زبان خامہ عطارد کی ناک میں دے تیر

ترا سمند ہے وہ تیز رو کہ وقت خرام
ق نظر ہو دیدۂ زرقا کی بھی نہ اُس کا نظیر

کہ سیرگاہ ہے اُس کی تو راہ یک روزہ
اور اُسکا شرق سے تا غرب عرصہ گاہ سیر

ترے جو فیل کی تعریف خسروا لکھوں
کروں حکایت شیریں و کوہکن تحریر

کہ فیل کوہ کجک تیشہ فیلباں فرہاد
وہ دونوں دانت صفا ایک ایک جوئے شیر

چلے نہ اشرفی آفتاب عالم میں
خطا شعاع سے اُسپر جو یہ نہ ہو تحریر

ابوظفر شہ والا گہر بہادر شہ
سراج دین نبیؐ سایۂ خدائے قدیر

شہ بلند نگہ شہریار والا جاہ
خدیو مہر کلہ خسرو سپہر سریر

جہاں مسخر و عالم مطیع و خلق مطاع
فلک موید و اختر معین و بخت نصیر

زمیں ہو سبز جو تیرے سحاب بخشش سے
تو بوٹی بوٹی سے ہر خاک کی بنے اکسیر

ق بچشم مہر اگر تیرا اثر اقبال
کرے نگاہ سر آبجو و آب غدیر

تو فلس فلس سے ہوں ماہیوں کے وقت شکار
نگین دست سلیماں بدست ماہی گیر

نہ ہے ثنا کے لیے تیرے اختتام و تمام
نہ ہے دعا کے لیے تیری انتہا و اخیر

مگر یہ ذوق ثنا سنج مدح خواں تیرا
غلام پیر کہن سال ایک فقیر حقیر

کرے ہے دل سے دعا یہ سدا فقیرانہ
سنا ہے جب سے کہ رحم خدا دعائے فقیر

الٰہی آب پہ ہو تا زمیں زمیں کو ثبات
زمیں پہ تا ہو فلک اور فلک کو ہو تدویر

فلک پہ چھوڑے نہ تا دامن مسیح حیات
زمیں پہ خضر کی تا ہو فنا نہ دامنگیر

عطا کرے تجھے عالم ہیں قادر قیوم | بجاہ و دولت و اقبال و عزت و توقیر
تن قوی و مزاج صحیح و عمر طویل | سپاہ وافر و ملک وسیع و گنج خطیر

سوالات

(۱) ذوق اور سودا کے کلام (قصائد) کا مقابلہ کیجیے۔

(۲) ذوق نے سودا کے قصائد پیش نظر رکھ کر قصائد تحریر کیے ہیں"۔ اس پر بحث کیجیے۔

(۳) قصیدے کی مختصر تاریخ لکھیے اور اس کے مستقبل سے بحث کیجیے۔

مزید مطالعے کے لیے

(۱) شعر الہند

(۲) اندازے

(۳) تاریخ ادب اُردو (سکسینہ)

مرزا اسد اللہ خاں غالب

قصیدہ تمہیدیہ در مدح سراج الدین بہادر شاہ ظفر

صبحدم دروازۂ خاور کھلا | مہر عالمتاب کا منظر کھلا
خسرو انجم کے آیا صرف میں | شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا
وہ بھی تھی اک سیمیا[1] کی سی نمود | صبح کو راز مہ و اختر کھلا
ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ | دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا
سطح گردوں پر پڑا تھا رات کو | موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا

---

[1] جادوگری کا ایک فن جس کے ذریعہ سے اشکال وہمی وغیرہ جن کا کوئی وجود نہ ہو نظر آنے لگیں ۱۲

صبح آیا جانبِ مشرق نظر — اک نگارِ آتشیں رُخ سر کھلا

تھی نظر بندی کیا جب ردِّ سحر — بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا

لا کے ساقی نے صبوحی کے لیے (گریز) — رکھ دیا ہے اک جامِ زر کھلا

بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ — کعبۂ امن و اماں کا در کھلا

تاجِ زرّیں مہرِ تاباں سے سوا — خسروِ آفاق کے مُنھ پر کھلا

شاہِ روشن دل بہادر شہ کہ ہے (مدح) — رازِ ہستی اُس پہ سر تا سر کھلا

وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں — مقصدِ نُہ چرخ و ہفت اختر کھلا

وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے — عقدۂ احکامِ پیغمبر کھلا

پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام — اُس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا

روشناسوں کی جہاں فہرست ہے — واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھلا

توسنِ شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب (ق) — تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھلا

نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب — تو کہے بُت خانۂ آزر کھلا

مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کے — منصبِ مہر و مہ و محور[1] کھلا

باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار — مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھلا

ہو جہاں گرمِ غزل خوانی نفس — لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا

غزل

کُنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا — کاشکے ہوتا قفس کا در کھلا

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے — یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

ہم کو ہے اس رازداری پر گھمنڈ — دوست کا ہے رازِ دشمن پر کھلا

---

[1] کرۂ متحرک کے درمیان ایک فرضی اور موہوم لکیر ۱۲

واقعی دل کو بھلا لگتا تھا داغ
زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا

ہاتھ سے رکھدی کب ابرو نے کماں
کب کمر سے غمزے کا خنجر کھلا

مفت کا کس کو بُرا ہے بدرقہ
رہروی میں پردۂ رہبر کھلا

سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک
آگ بھڑکی مینھ اگر دم بھر کھلا

نامے کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ
رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

دیکھیو غالب سے گر اُلجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال
پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا

خامے نے پائی طبیعت سے مدد
بادباں کے اُٹھتے ہی لنگر کھلا

مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ
یاں عرض سے رتبۂ جوہر کھلا

مہر کانپا۔ چرخ چکّر کھا گیا
بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا

بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب
اب علوِ پایۂ منبر کھلا

سکۂ شہ کا ہوا ہے روشناس
اب عیارِ آبروئے زر کھلا

شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ
اب آلِ سعیِ اسکندر کھلا

ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے
اب فریبِ طغرل و سنجر کھلا

ہو سکے کیا مدح؟ ہاں اک نام ہے (خاتمہ)
دفترِ مدحِ جہاں داور کھلا

فکر اچھی پر ستائش نا تمام
عجزِ اعجازِ ستائش گر کھلا

تم کرو صاحبقرانی جب تلک
ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا

مرثیہ

یہ بہت پُرانا دستور ہے کہ کسی عزیز قریب خواہ امیر و رئیس کی وفات پر اُس کی زندگی کے حالات کا بیان اور اُس کی خوبیوں کا اظہار کر کے روتے ہیں۔ اور انھیں جذبات کو جمع کر کے لکھتے ہیں اُس کو مرثیہ کہتے ہیں۔ مرثیہ عرب اور قدیم قوموں نیز فارسی کی شاعری میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے اس کے لیے کوئی مخصوص فرد نہیں ہے۔ اُردو میں بھی اسی غرض سے مرثیہ کا وجود ہوا۔ مگر زیادہ تر مرثیہ کے معنے یہی لیے گئے جس میں واقعۂ کربلا اور حضرت امام حسینؑ کا حال نظم کیا جائے اس کے واسطے کسی مخصوص بحر۔ مخصوص صنف کلام کی پابندی نہ تھی۔ چنانچہ قدما کے مرثیے، مثلث، مربع وغیرہ میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مگر سودا کے زمانے سے مرثیہ مسدّس کے طور پر کہا جانے لگا۔ اور اب تک مسدّس ہی میں کہا جاتا ہے۔ اور مرثیہ گو اسی کی پابندی کرتے ہیں۔ مرزا دبیر۔ میر انیس۔ میر مونس مرزا دلگیر۔ میر ضمیر وغیرہ تمام مرثیہ گویوں کے مرثیے مسدّس کے طور پر ہی ملتے ہیں۔

پہلے زمانہ میں مرثیہ محض بین و بکا کے مضامین کے واسطے مخصوص تھا اور اس میں حزن کے اظہار کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

مگر زمانہ جیسے جیسے ترقی کرتا گیا اُردو میں بہت سی جدید چیزیں اس میں شامل کر دی گئیں۔ تمہید۔ بیان ولادت۔ تلوار۔ گھوڑے وغیرہ کی تعریف۔ مختلف مناظر۔ اور آخر کے دور میں بہار کے مضامین۔ ساقی نامے وغیرہ بھی اس میں لکھے جانے لگے چنانچہ اس وقت تک یہ سب چیزیں مرثیہ میں موجود ہیں۔ اور ابتدائی بندوں کو جن میں کچھ تمہیدی مضمون نظم ہوتے ہیں اس کو چہرہ کہا جاتا ہے۔

جو مرثیہ مستزاد کے طور پر لکھا جائے اس کو اکثر نوحہ اور غزل کے طور پر جو لکھا جائے اُس کو سلام کہتے ہیں۔ اور اس میں اکثر مجرئی کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔

مرثیہ کے لیے بیان میں برجستگی۔ واقعات میں تناسب۔ تسلسل ہر فرد مرثیہ کے لیے اس کے درجے اور مرتبے کا خیال رکھنا شوکت الفاظ کے ساتھ فصاحت۔ ہر جگہ اور ہر مقام کے لیے مناسب حال بیان۔ رسم و رواج زمانہ۔ واقعہ کی صحیح تصویریں ہر شخص کے کردار کا تعین۔ یہی سب چیزیں ہیں۔ جو میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے یہاں اکثر جگہ موجود ہیں۔ جن کے مراثی درج انتخاب ہیں۔

میر ببر علی۔ انیسؔ

آپ کا اسم شریف میر ببر علی، تخلّص انیسؔ۔ اور آپ کے والد ماجد کا نام میر مستحسن اور تخلّص خلیقؔ تھا۔ آپ کا مولد



شبیہ میر ببر علی انیس اعلی اللہ مقامہ

فیض آباد ہے۔ یہیں پیدا ہوئے۔ اور یہیں رسمی تعلیم و تربیت پائی۔ آپ کے اسلاف ہرات کے رہنے والے تھے جو اپنے وطن مالوف کو چھوڑ کر پرانی دِلّی میں آ کر آباد ہوئے۔ چنانچہ آپ کے پردادا میر ضاحک دہلی ہی میں پیدا ہوئے اور یہیں عمر کا بڑا حصّہ بسر کیا۔ جب اہل کمال پریشان روزگار ہو کر وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے تو میر ضاحک بھی فیض آباد چلے آئے اور نواب شجاع الدولہ کے دریائے جود و کرم سے سیراب ہوئے چونکہ ان کے ساتھی بھی بہت سے یہیں آ گئے تھے۔ اس لیے اُن کا وطن مالوف بن گیا۔ اور پھر کبھی دہلی کا رُخ نہیں کیا۔ میر حسن مصنّف مثنوی سحر البیان میر ضاحک کے خلف اکبر تھے جو عالم جوانی ہی میں دلّی سے چلے آئے اور پھر عمر بھر فیض آباد و لکھنؤ میں رہے۔ میر خلیق کی ولادت فیض آباد ہی میں ہوئی۔ اور آپ کے تینوں نامور فرزند میر انیس، میر مونس میر اُنس بھی اسی جگہ متولد ہوئے۔ اس لحاظ سے میر انیس نہ دلّی کے متوطن ہیں نہ لکھنؤ کے بلکہ فیض آباد کو آپ پر ناز ہو سکتا ہے میر انیس کی ولادت ۱۲۲۰ھ کے قریب ہوئی اور پھر پندرہ سولہ برس کی عمر میں میر انیس اور میر مونس فیض آباد سے لکھنؤ چلے آئے۔ اور یہیں رہنے لگے میر اُنس اور میر خلیق وہیں مقیم رہے۔ مدت کے بعد میر اُنس بھی لکھنؤ چلے آئے۔ البتہ میر خلیق نے اپنے قدیمی مکان کو نہ چھوڑا۔ مگر موت اُن کو بھی لکھنؤ میں لے آئی اور اتفاق سے وہ بھی یہیں پیوند

خاک ہوئے۔

میر صاحب نہایت پابند وضع۔ بلند اخلاق۔ خود دار شہسواری۔ سیف زنی وغیرہ کے فن میں دخل رکھنے والے انسان تھے۔ ان کی علمی معلومات گو عالمانہ درجہ پر نہ تھی مگر ضروری مسائل علمی سے بے خبر نہ تھے۔ تدقیق و تحقیق کا ان کو نہایت ذوق تھا اسی وجہ سے وہ ان تمام باتوں سے واقف تھے جو ایک اہل فن کے لیے ضروری ہیں۔

ان کو اپنے بھائی میر مونس کے ساتھ انتہائی اُنس تھا۔ وہ ان کے شاگرد بھی تھے۔ اور مرثیہ گوئی میں اسی وجہ سے اُن کے کلام پر میر صاحب کے کلام کا دھوکہ ہوتا ہے۔ شیخ امام بخش ناسخ۔ خواجہ حیدر علی آتش۔ میر عشق وغیرہ میر صاحب کے معاصرین میں سے تھے۔ غزل گوئی وغیرہ میں اُن کا پایہ کتنا ہی بلند ہو۔ مگر فن مرثیہ گوئی میں کوئی اُن کا مدِمقابل نہ تھا۔ ہاں مرزا دبیر ضرور ایسے تھے جنھیں بعض لوگوں نے اُن کے ہم پلہ تجویز کر لیا۔ اگرچہ ان کا رنگ ان سے بالکل الگ تھا۔ کیونکہ میر صاحب سادگی بیان۔ روانی۔ سلاست۔ فصاحت اور مصوری بیان کے دلدادہ تھے۔ اور مرزا دبیر بلاغت۔ معانی آفرینی۔ جدّت مضمون کے شیدا۔ اِسی سے ان دونوں کا مقابلہ ایک بے معنی سی بات ہے۔

کہا جاتا ہے کہ فن شعر گوئی کی ابتدا میر صاحب نے غزل گوئی سے کی مگر اپنے بزرگ باپ اور شعر و شاعری کے رہنما میر خلیق

کے سمجھانے سے اُنھوں نے اُس کو ترک کر کے مرثیہ کی طرف توجہ کی اور بہت جلد اس فن میں اتنی شہرت حاصل کر لی کہ اُن کے معاصرین ان پر رشک کھانے لگے۔ مرثیہ گوئی کوئی نئی چیز نہیں تھی بلکہ شعرائے عرب و فارس نے بھی اس میں کثرت کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے اور کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ حضرت آدم کا کہا ہوا مرثیہ موجود ہے جو اُنھوں نے سُریانی زبان میں اپنے بیٹے ہابیل کے غم میں کہا تھا۔ بہر حال ہندوستان میں میر و سودا اور ان سے پہلے لوگوں کے مرثیے موجود ہیں۔ اُس وقت تک مرثیہ میں سوائے بین و بکا کی شان کے اور کچھ نہ تھا۔ مرزا دگیر، فصیح، میر ضمیر، میر مستحسن خلیق نے اس قدیم وضع کو چھوڑ کر اس میں ایک جدّت پیدا کی اور اس کو مسدّس کے طریقہ پر لے آئے۔ طرزِ بیان کو بدل دیا۔ اور اس کو ایک فن کی حیثیت بخش دی۔ جب میر انیس اور مرزا دبیر کی نوبت آئی تو اُنھوں نے اس فن کو مکمّل بنا دیا اور بہت سی ایسی چیزوں کا اضافہ کیا جو اس میں پہلے موجود نہ تھیں۔ چہرہ۔ سراپا گھوڑے اور تلوار کی تعریف۔ صبح و شام کے مناظر۔ محاکات کی بہترین مثالیں۔ یہ سب کی سب چیزیں ایسی ہیں جو قدیم مرثیہ نگاروں کے یہاں مفقود اور ان دونوں باکمالوں کے یہاں موجود ہیں۔

میر انیس کے مراثی کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔ بیان کی صفائی۔ زبان کی روانی۔ واقعہ کا تسلسل کے ساتھ ڈرامانگاری

کی طرح بیان۔ ہر شخص کے مدارج کا لحاظ۔ الفاظ کا دروبست محاورات کی فراوانی میں آمد اور تغزل کی شان۔ بیان کی یکسانی اور ہمواری۔ یہی سب چیزیں ہیں جو اُن کو معاصرین سے ممتاز کرتی ہیں۔ اگرچہ اُن کی زبان میں بعض ایسی باتیں ہیں جو فصحائے معاصرین سے علحدہ ہیں۔ مثلاً بعض الفاظ و محاورات کی تبدیلی۔ بعض الفاظ کی تذکیر و تانیث کا اختلاف مگر ان سب کو میر صاحب یہ فرما دیتے تھے کہ یہ میرے گھر کی زبان ہے۔ بعض فروگذاشتیں بھی ہیں مگر اس سے اُن کے کمال میں کوئی نقص نہیں آتا۔ اور باایں ہمہ وہ بہترین قادرالکلام مرثیہ گو ہیں۔ بلکہ سب سے اُن کا پایہ اس فن خاص میں بلند ہے۔

مدت تک آپ کی مرثیہ خوانی صرف لکھنؤ تک محدود رہی۔ مگر تباہی لکھنؤ کے بعد عظیم آباد۔ حیدرآباد وغیرہ بھی تشریف لے گئے اور وہاں آپ نے اپنے کمال کے جوہر دکھا کر دنیا بھر کو اپنا قدرداں بنا لیا۔ مرثیہ گوئی کے علاوہ مرثیہ پڑھنے میں بھی آپ کو کمال حاصل تھا۔ جو کچھ پڑھتے اُس کی تصویر کھینچ کر دکھا دیتے تھے۔ آخر ۷۰ سال کی عمر پا کر ۲۹۔ ذیقعدہ روز دوشنبہ مطابق دسمبر ۱۸۷۴ء روز جمعہ اور بقول بعض ۱۲۹۱ھ روز دوشنبہ ۷۲ سال کی عمر میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا اور یہیں مدفون ہوئے۔ آپ کے مرثیوں میں سے دو مرثیے درج ذیل کیے جاتے ہیں۔

جب رن میں سربلند علیؑ کا علم ہوا فوجِ خدا پہ سایۂ ابرِ کرم ہوا
چرخِ زبرجدی پئے تسلیم خم ہوا پنجے پہ سات بار تصدق حشم ہوا
دیکھا نہ تھا علم جو کبھی اس نمود کا
دونوں طرف کی فوج میں غل تھا درود کا

وہ شان اُس علم کی وہ عباسؑ کا جلال نخلِ زمردی کے تلے تھا علیؑ کا لال
پنجے پہ جان دیتی تھیں پریاں یہ تھا حال غُل تھا کہ دوشِ حور پہ بکھرے ہوئے ہیں بال
ہر لہر آبدار تھی کوثر کی موج سے
طوبیٰ بھی دب گیا تھا پھریرے کی اوج سے

تھا پنجتن کا نور جو پنجے پہ جلوہ گر انجم کی تیلیوں میں بھی تھا روشنی کا گھر
فرشتے نثار کرتے تھے اُٹھ اُٹھ کے اپنا زر تکتے تھے فوق سے تو ملک تحت سے بشر
اللہ رے چمک علمِ بوترابؑ کی
تارہ نظر بنی تھی کرن آفتاب کی

قربان احتشامِ علمدارِ نامور رُخ پر جلالتِ شہِ مرداں تھی سربسر
چہرہ تو آفتاب سا اور شیر سی نظر قبضے میں تیغ بر میں زرہ دوش پر سپر
چھایا تھا شور لشکرِ ابنِ زیاد پر
غُل تھا چڑھے ہیں شیرِ الٰہی جہاد پر

تکتے کبھی نہ دیکھی تھی اس حسن کی سپاہ دنیا بھی خوبیوں کا مرقع ہے واہ واہ
دیکھیں کسے کہ ہو ایک ایک رشکِ ماہ جاتی ہے جس کے رُخ پہ تو پھرتی نہیں نگاہ

دیکھو انھیں تو موتیے سے ہے رونق زمین کو
چن چن کے حسینؑ لائے ہیں کس کس حسین کو

شہرہ بہت تھا حُسن میں کنعاں کے ماہ کا
قصّہ سُنا ہوا ہے زلیخا کی چاہ کا
یاں آفتاب کو نہیں یارا نگاہ کا
یوسف ہے ایک ایک جواں اس سپاہ کا
سُنتے تھے ہم کہ عالمِ ایجاد زشت ہے
ایسے چمن کھلے ہیں تو دنیا بہشت ہے

ہمشکلِ مصطفےٰ کا ہے کیا حُسن کیا جمال
صبحِ جبیں ہے اور شبِ گیسو ہے بےمثال
یہ لب یہ خط یہ چشم یہ ابرو یہ رُخ یہ خال
یاقوت و مشک و نرگس و نجم و مہ و ہلال
اک گُل پہ یاں ہزار طرح کی بہار ہے
چہرہ نہ کہیے قدرتِ پروردگار ہے

لختِ دلِ حسنؑ بھی ہے کس مرتبہ حسین
جس کے چراغِ حُسن سے روشن ہے یہ زمین
یہ زلفِ مشک بیز یہ آئینۂ جبین
سرمایۂ خطا و ختن کائناتِ چین
رُخ کی بلائیں لیتی ہیں پریاں کھڑی ہوئی
سہرے کی ہر لڑی سے ہیں آنکھیں لڑی ہوئی

نامِ خدا ہیں عونؑ و محمدؑ بھی کیا شکیل
اک مہرِ بے نظیر ہے اک بدرِ بے عدیل
افروختہ ہیں رُخ یہ شجاعت کی ہے دلیل
ہمّت بڑی ہے گو کہ ہیں عمریں ابھی قلیل
مثلِ علیؑ ہیں جنگ و جدل پر تلے ہوئے
دونوں کے پنجوں کے ہیں ڈورے کھلے ہوئے

عباسؑ نامور بھی عجب سج کا ہے جواں
نازاں ہے جس کے دوشِ منور پہ خود نشاں
حمزہؓ کا رعب صولتِ جعفرؓ علیؑ کی شاں
ہاشم کا دل حسینؑ کا بازو حسنؑ کی جاں

کیونکر نہ عشق ہو شہ گردوں جناب کو
حاصل ہیں سیکڑوں شرف اس آفتاب کو

اس مہر کو تو دیکھو یہ ذرّے ہیں جسکے سب
سرتاج آسمان و زمیں نورِ عرش رب
ابرِ کرم خدیو عجم خسروِ عرب
عالی ہمم امام اُمم شاہِ تشنہ لب
جنباں زبان خشک ہے ذکرِ الٰہ میں
گویا کھڑے ہیں ختم رُسل رزمگاہ میں

کیا فوج تھی حسینؓ کی اس فوج کے نثار
اک ایک آبروئے عرب مفخرِ روزگار
جرّار و دیں پناہ و نمودار نامدار
لڑکوں میں سبزہ رنگ کوئی کوئی گلعذار
فوجیں کوئی سماتی تھیں ان کی نگاہ میں
وہ سب پلے تھے بیشۂ شیرِ الٰہ میں

اک ایک ملک جرأت و ہمت کا بادشاہ
کیواں خدم سپہر حشم عرش بارگاہ
آنکھیں غزالِ رشک مگر شیر کی نگاہ
وہ رُعب چیتونوں میں کہ اللہ کی پناہ
دیکھا تو دل کو توڑ کے برچھی نکل گئی
ابرو ذرا جو ہل گئے تلوار چل گئی

ہنستا ہوا بڑھا کوئی قبضہ کو چوم کے
بھالا کسی نے رکھ لیا کاندھے پہ جھوم کے
بولا کوئی یہ غول ہیں کیا شام و روم کے
ٹکڑے اڑیں گے آج عمرؔ و شمرِ شوم کے
نامرد جو ہیں آنکھ چراتے ہیں مرد سے
دونوں کو چار کر کے پھرینگے نبرد سے

بڑھ کر کسی نے تیر ملایا کمان سے
نیزہ کوئی ملانے لگا آن بان سے
نعرہ کسی کا پار ہوا آسمان سے
تلوار کھینچ لی کسی صفدر نے میان سے

اک شور تھا کہ تلخ کیا ہے حیات کو
لاشوں سے چل کے پاٹ دو نہر فرات کو

اک اک جری کو نشۂ جرأت کا جوش ہے — عالم ہے بیخودی کا پہ مرنے کا ہوش ہے
ہر صف میں یا علیؑ و ولی کا خروش ہے — کہتے ہیں بار بار کہ سر بار دوش ہے
مشتاق ہیں وہ پیاس میں تیغوں کے گھاٹ کے
ڈر ہے کہ مر نہ جائیں گلے کاٹ کاٹ کے

حسرت سے کی سوئے رفقا شاہ نے نظر — بولے حبیبؓ نذر کو حاضر ہیں سب کے سر
فرمایا شہ نے ہم بھی ہیں آمادۂ سفر — اچھا جہاد کو بڑھے ایک ایک نامور
یہ راہِ حق ہے جو قدم آگے بڑھائے گا
دربارِ مصطفےٰ میں وہی پہلے جائے گا

مژدہ یہ سن کے شاد ہوئے غازیانِ دین — اک اک دلیر جانے لگا سوئے فوجِ کیں
جب نعرہ زن ہوئے صفتِ شیرِ خشمگیں — تھرائے آسماں کے طبق ہل گئی زمیں
برپا تھا شورِ حشر دلیروں کی حرب سے
فوجیں تو کیا جہاں تہ و بالا تھا ضرب سے

اشرار سے جہادِ حبیبؓ و زہیرِ قینؓ — گویا بپا تھا معرکۂ خندق و حنین
جب مر گئے دو عاشقِ سلطانِ مشرقین — مقتل میں پیٹتے ہوئے دوڑے گئے حسینؑ
یوں جا کے روئے انکے تنِ پاش پاش پر
جسطرح بھائی روتا ہے بھائی کی لاش پر

خالی ہوا قدیم رفیقوں کا جب پرا — کانپا سپہر شہ نے دمِ سرد یوں بھرا
گھٹنے لگا عزیزوں کا بھی جب چمن ہرا — گہہ روئے آپ ہاتھ جگر پر کبھی دھرا

لٹنے جو یک بہ یک گئے ہاتھوں سے کھو گئے
ٹکڑے حسنؑ کی طرح کلیجے کے ہو گئے

تھی قہرِ حق عقیل کے پوتوں کی کارزار — شمشیرِ حیدری کا نمونہ تھے جن کے وار
عزت عرب کی کر گئے جعفرؓ کے یادگار — تھے تین چار شیر کہ جھپٹے سوئے شکار
فتح و ظفر تھی مثلِ علیؑ اختیار میں
پنجے میں تھا وہی جسے تاکا ہزار میں

نکلے برادرانِ علمدار صف شکن — دکھلا دیے علیؑ کی لڑائی کے سب چلن
بے سر تھے مورچوں میں جوانانِ پیلتن — لاشوں پہ لاشیں گرتی تھیں تا تھا رن پہ رن
آنکھوں میں پھر رہی تھی چمک ذوالفقار کی
عباسؑ داد دیتے تھے ایک ایک وار کی

تھا چھوٹے بھائیوں کے لئے مضطرب جو دل — گہ شہ کے پاس تھے کبھی لشکر کے متصل
نعرہ یہ تھا کہ شیر ہے ماں کا تمھیں بحل — ہاں روکیو نہ ہاتھ بدن گو ہے مضمحل
یہ وقت آبرو ہے بس اب جد و کد کرو
ہاں بھائیو امام کی اپنے مدد کرو

الٹو پروں کو اور صفوں کو بچھا کے آؤ — ساحل کے پاس خون کا دریا بہا کے آؤ
جب باگ اٹھاؤ فوج کے اُس پار جا کے آؤ — یا مر کے آؤ یا انھیں رن سے بھگا کے آؤ
ہاں صفدرو نشاں نہ رہے فوجِ شام کا
بیٹوں کو پاس چاہیے بابا کے نام کا

رو کر حسینؑ کہتے تھے بھائی سے دمبدم — دولت پدر کی لٹتی ہے اور دیکھتے ہیں ہم
جینے نہ دیگا آہ ہمیں بھائیوں کا غم — عباسؑ عرض کرتے تھے اے قبلۂ امم

اب باپ کی جگہ شہ عالی مقام ہیں
صدقے نہ کسطرح ہوں کہ ہم سب غلام ہیں

آیا نظر جو لاشۂ نوشاہ نیک خو — اکبرؑ کی چشم تر سے ٹپکنے لگا لہو
کی غیظ کی نظر طرف لشکرِ عدو — پہلو سے آئے روتے ہوئے شہ کے روبرو
نکلی یہ بات جوشِ بکا میں زبان سے
قاسمؑ کے ساتھ جائینگے ہم بھی جہان سے

بچپن سے ہم سے یہ نہ ہوے تھے کبھی جدا — سوئے تو ایک فرش پہ کھیلے تو ایک جا
طفلی کا ساتھ چھوٹ گیا وا مصیبتا — مرجائے ایسا بھائی تو جینے کا کیا مزا
حسرت یہ ہے کہ تیغوں سے تن پاش پاش ہو
پہلو میں ابن عم کے ہماری بھی لاش ہو

شہ نے کہا کہ سچ ہے یہ ایسا ہی ہے الم — خالق جہاں میں بھائی کا بھائی کو دے نہ غم
بازو کا ٹوٹنا اجل آنے سے کیا ہے کم — مر مر کے غم میں بھائی حسنؑ کے جیے ہیں ہم
تازہ تھا غم پدر کا خوشی دل سے فوت تھی
عباسؑ نامدار نہ ہوتے تو موت تھی

بھائی کے بعد ان سے ملی لذتِ حیات — بیکس کے غمگسار تھے یہ یا خدا کی ذات
خالی نہ پائی مہر و مروت سے کوئی بات — سویا میں گر تو انکو کٹی جاگنے میں رات
صدمے بھلائے دل سے حسنؑ کی جدائی کے
رونے نہیں دیا مجھے ماتم میں بھائی کے

ہے انکے اتحاد کا سب سے جدا مزا — بیٹے کا لطف بھائی کا حظ باپ کا مزا
ملتا ہے انکی بات میں ہر دم نیا مزا — اوجھل جو آنکھ سے ہوں تو جینے کا کیا مزا

قائم رکھے خدا کہ علیؑ کے نشان ہیں

مالک یہی ہیں گھر کے یہی تن کی جان ہیں

قوت جگر کی تم ہو تو یہ بازوؤں کا زور — بچھڑا جو ایک دو میں تو پھر ہیں کنارِ گور

ہوتا ہے زخمِ دل پہ نمک آنسوؤں کا زور — جب پتلیاں نہ ہوئیں تو چشمِ بشر ہے کور

تم پہلوؤں میں تھے جو یہ بیکس سنبھل گیا

پھر خاتمہ ہے جسم سے جب دم نکل گیا

ان سے نشاں علیؑ کا ہے تم سے ہمارا نام — گھر مٹ گیا نبیؐ کا جو دونوں ہوئے تمام

میت کے دفن کا بھی مناسب ہے اہتمام — مرنے کے بعد کوئی تو آئے ہمارے کام

تربت پہ تم سے گل ہوں تو دل باغ باغ ہو

اندھیر ہے جو قبر پہ بے چراغ ہو

کیجیو نہ ذکرِ ہجر یہ صدمہ ہے دلخراش — بہرِ پدر کرو کفن و گور کی تلاش

ہوگا یہ جسم ظلم کے تیغوں سے پاش پاش — دو شخص چاہئیں کہ اٹھائیں ہماری لاش

رونے کو کوئی دوست نہ یاور سرہانے ہو

فرزند پائنتی ہو برادر سرہانے ہو

اکبر نے سُن کے باپ سے یہ اشک خوں بہائے — عباسؑ بول اُٹھے نہ خدا وہ گھڑی دکھائے

ہے زندگی یہی کہ ہمیں پہلے موت آئے — خاک اس غلام پر کہ جو آقا کی لاش اٹھائے

دیتے ہیں جان اہلِ وفا نام کے لیے

پائے ہیں کیا یہ ہاتھ اسی کام کے لیے

بس گر پڑا یہ کہہ کے قدم پر وہ باوفا — جھک کر کہا حسینؑ نے بھائی یہ کیا کیا

قاسم کا ذکر کرتے تھے ہمشکلِ مصطفےٰ — باتیں تو اُن سے تھیں تمھیں کیوں غیظ آگیا

ہم تم تو ساتھ گلشنِ ہستی سے جائیں گے
اچھا ہماری لاش کو اکبر اُٹھائیں گے

اُٹھیے قدم سے آپکی اُلفت کے میں نثار — غصہ میں بھول جاتے ہو بھیا ہمارا پیار
آنکھیں قدم پہ مَل سکے یہ بولا وہ غمگسار — بے اذنِ جنگ سر نہ اُٹھائیگا خاکسار
ایسا نہ ہو خجل ہوں رسالتمآب سے
پہلے مروں گا اکبرِ عالی جناب سے

عباسؑ شہ کے گرد پھرے اُٹھکے سات بار — بھائی کو گھر میں لیچلے جب شاہِ ذی وقار
بولا یہ پیک شاطرِ فوجِ ستم شعار — وہ اذنِ جنگ پا چکے عباسؑ نامدار
خود دیکھ کر یہ حال پھرا ہوں میں راہ سے
ملنے گئے ہیں خیمہ میں ناموسِ شاہ سے

تھے آگے آگے ہاتھوں کو تھامے کہ امام — نعرہ یہ دمبدم تھا کہ اب ہم ہوئے تمام
تیغوں سے گھاٹ روک لو آیا وہ نیکنام — اب معرکہ ہے قہر کا اے ساکنانِ شام
دیکھو بچے رہو کہ لڑائی ہے شیر سے
چھوٹے گی مشکلوں میں ترائی دلیر سے

دل ہل گئے سپاہ کے سنتے ہی یہ خبر — کانپے مثالِ بید جوانانِ پُر جگر
ہلچل میں اس طرف کے پرے ہو گئے اُدھر — ساحل سے ہٹ کے سب پکارے کہ الحذر
پیچھے ہٹیں صفیں یہ تلاطم عیاں ہوا
دریا جو باڑھ پہ تھا وہ اُتار داں ہوا

ٹوٹے وہ مورچے جو بنائے تھے بے جدال — برچھی گری زمین پہ کسی کی کسی کی ڈھال
اشرار پر ہیبتِ خلفِ شیرِ ذوالجلال — کانپی زمیں کھڑے ہوئے رووں میں تنوں کے بال

مُنھ زرد ہو کے رہ گیا ہر نوجوان کا
دشتِ نبرد کھیت بنا زعفران کا

تھا شش جہت میں غُل کہ یہ ہے روزِ انقلاب — ٹوٹے گا اس زمیں پہ درقِ ابنِ بوتراب
اس شیر پر نہ ہوگی کوئی فوج فتحیاب — بس اب بنائے عالمِ امکاں ہوئی خراب
حملہ غضب ہے بازوئے شاہِ حجاز کا
لنگر نہ ٹوٹ جائے زمیں کے جہاز کا

تھی ابتری سپاہِ ضلالت شعار میں — اس صف میں تھی وہ صف یہ قطار اُس قطار میں
سو بار جو لڑے تھے اکیلے ہزار میں — وہ جائے امن ڈھونڈھتے تھے کارزار میں
چہرے تھے زرد خوف سے حیدر کے لال کے
نامرد منھ چھپائے تھے گھونگھٹ پہ ڈھال کے

سرکردہائے فوجِ مخالف تھے بے حواس — کچھ شمر کے قریب تھے کچھ تھے عمرو کے پاس
سب کا یہ قول تھا کہ ہوئی زندگی سے یاس — ضربِ علیؑ ہے ضربِ علمدارِ حق شناس
طاقت سے ہیں بھرے ہوئے بازو دلیر کے
خیبر کشا کا زور ہے پنجہ میں شیر کے

نکلا وہ شیر نیمچے باہر علم لیے — مجرے کو آئی فتح سپاہِ حشم لیے
جرأت نے بڑھ کے بوسۂ تیغِ دودم لیے — نصرت نے چومے ہاتھ ظفر نے قدم لیے
خورشید کا جلال نگاہوں سے گر گیا
اقبال سر کے گرد ہُما بن کے پھر گیا

آیا سجا ہوا وہ براقِ سمند سیر — تھا خود کڑا وہ اُڑنے کو تیار مثلِ طیر
ہوتا تھا اس کے ڈر سے غزالوں کا حال غیر — الحق سپاہِ شر اُسے روکے تو یہ بخیر

صرصر قدم کی گرد کو پاتی نہیں کبھی
ڈھونڈھے بشر پری نظر آتی نہیں کبھی

رکھا قدم رکاب میں حیدرؑ کے لال نے — نعلین پا کو فخر سے چوما ہلال نے
بخشی جو صدرِ زیں کو ضیا خوش جمال نے — دُم کو چنور کیا فرسِ بے مثال نے
کس ناز سے وہ رشکِ غزالِ ختن چلا
طاؤس تھا کہ سیر کو سوئے چمن چلا

خوشبو سے ارضِ پاک ریاضِ جناں بنی — گرد اڑ کے غازۂ رخِ لیلیٰ وشاں بنی
جلوے سے راہِ دشتِ بلا کہکشاں بنی — ذرّے بنے نجوم زمیں آسماں بنی
سُم بدر تھے تو نعل بھی چاروں ہلال تھے
نقشِ سُمِ فرس سے ہزاروں ہلال تھے

پہونچے جو دشتِ کیں میں اڑاتے ہوئے فرس — گھوڑے کو ہاتھ اٹھا کے یہ آواز دی کہ بس
دیکھیں صفیں جمی ہوئی چپ و راست و پیش و پس — نعرہ کیا کہ نہر پہ جانے کی ہے ہوس
روکے گا جو وہ موت کے پنجہ میں آئے گا
ہٹ جاؤ سب کہ شیر ترائی میں جائے گا

بولے یہ بڑھ کے فوجِ مخالف کے پہلواں — دیکھا نہیں کبھی کہ ہٹے لشکرِ گراں
یاں سب ہیں روم و شام کے جنگ آزما جواں — ہاں آئیے تو کھینچ کے تیغِ شرر فشاں
بودے نہیں ہیں کچھ جو نگہباں ہیں گھاٹ کے
سر پھینک دینگے نہر میں خنجر سے کاٹ کے

سنتے ہی یہ جلال میں آیا علیؑ کا لال — نعرہ کیا کہ تم ہمیں روکو گے کیا مجال
یہ مورچے ہیں کیا ہمیں جنکا ہو کچھ خیال — اکدم میں چیونٹیوں کی طرح ہوگئے پائمال

بھاگو کے پھینک پھینک کے تیغیں لڑائی سے
لو مرد ہو تو اب نہ سرکنا ترائی سے

وہ کون ہے نکل کے جو طاقت کسی میں ہو
لے تیغ میاں سے جو شجاعت کسی میں ہو
گرمائے رخش کو جو حرارت کسی میں ہو
آئے جو حرب و ضرب کی قدرت کسی میں ہو
دو ہاتھ میں علیؑ کے پسر دار پار ہیں
دریا نہیں کہ رک گیا ہم ذوالفقار ہیں

تم کیا پہاڑ بیچ میں گر ہو تو ٹال دیں
شیروں کو ہم ترائی سے باہر نکال دیں
مہلت نہ ایک دم جنگ و جدال دیں
پانی تو کیا ہے آگ میں گھوڑے کو ڈال دیں
منھ دیکھتے ہیں جو کہ نگہباں ہیں گھاٹ کے
لیجائیں گھر پہ تیغ سے دریا کو کاٹ کے

جرأت جلو میں رہتی ہے نصرت رکاب میں
سر کاٹتے ہیں پیر کے تیغوں کی آب میں
لکھے ہوئے ہیں شیروں کے حملے کتاب میں
فصلیں ہیں اپنے زور کی خیبر کے باب میں
ناصر ہیں بارگاہ فلک بارگاہ کے
دفتر الٹ دیے ہیں عرب کی سپاہ کے

یہ ذکر تھا کہ فوج کی جانب سے تیر آئے
نیزے اٹھا کے شیر کے منھ پر شریر آئے
یہ بھی جھپٹ کے مثل شہ قلعہ گیر آئے
گیتی ہلی غضب میں جناب امیرؑ آئے
گھوڑا اڑا پروں کو سواروں کے توڑ کے
لپکی صفوں پہ سیف بھی کاٹھی کو چھوڑ کے

آمد تھی تیغ کی کہ اجل کا پیام تھا
یہ صف اخیر تھی وہ رسالہ تمام تھا
بجلی سا ہر جگہ فرس تیز گام تھا
ششدر تھی موت چار طرف قتل عام تھا

اس غول پر کبھی تھی کبھی اس قطار پر
پڑتا تھا ایک تیغ کا سایہ ہزار پر

وہ تیغ کی چمک وہ تڑپ راہوار کی — رفرف کی اک شبیہ تو اک ذوالفقار کی
شوکت سوار میں شہِ دُلدل سوار کی — حملوں میں شان سب اسدِ کردگار کی
چتون وہی غضب وہی بے باکیاں وہی
پھرتی وہی جھپٹ وہی چالاکیاں وہی

توڑا یہ مورچہ یہ صف اُلٹی اُدھر پھرے — تلوار خوں میں آپ پسینہ میں تر پھرے
یوں خاک پر گرا کے لعینوں کے سر پھرے — جیسے شکار کھیلے ہوئے شیرِ نر پھرے
تھی قہر کی نگاہ غضب کا جلال تھا
آنکھیں بھی سرخ سرخ تھیں چہرہ بھی لال تھا

بے شک تھا اُس کا ہاتھ امیرِ عرب کا ہاتھ — پہونچا دغا میں سو طرف اک تشنہ لب کا ہاتھ
آئی اجل اُٹھا جو کسی بے ادب کا ہاتھ — شیرِ خدا کے شیر نے مارا غضب کا ہاتھ
بازو پہ آئی تیغِ دو دم شانہ کاٹ کے
پہونچے کو بھی قلم کیا دستانہ کاٹ کے

جس کی طرف نظر دمِ جنگ و جدال پھری — کچھ ہٹ کے تیغ سے اسی جانب اجل پھری
رہوار یوں پھرا کہ اشارے میں کل پھری — تلوار بھی گلوں کی طرف برمحل پھری
ایسے جری سے کس کو مجالِ مصاف تھی
یوں پھر کے صف کی صف کو جو دیکھا تو صاف تھی

نیزے اُدھر قلم تو اِدھر برچھیاں قلم — ترکش دو نیم ٹکڑے کمانیں نشاں قلم
ہر ہاتھ میں قلم کی طرح استخواں قلم — منھ تیغ کا خراب سناں کی زباں قلم

جب تن سے آئی سر پہ کسی بد خصال کے
گویا سموم چل گئی پھولوں پہ ڈھال کے

مغفر نہ سر کے پاس نہ خنجر کمر کے پاس
بیٹے کے پاس باپ نہ بیٹا پدر کے پاس
قبضہ کے پاس تیغ نہ دستہ تبر کے پاس
کڑیاں زرہ کے پاس نہ دامن سپر کے پاس
نیزے نہ تھے سناں پہ نہ پرچم نشان پر
پیکاں نہ تیر پر تھے نہ چلّے کمان پر

گرمی سے تشنگی میں کلیجہ تھا آب آب
پڑ پڑ رہا تھا قلب کو موجوں کا پیچ و تاب
آجاتے تھے قریب جو ساغر بکف حباب
کہتا تھا منہ کو پھیر کے وہ آسماں جناب
عباسؑ آبرو میں ابھی فرق آئے گا
پانی پیا تو نام وفا ڈوب جائے گا

دریا سے مشک بھر کے جو نکلا وہ نیک نام
اُمڈی سیہ گھٹا کی طرح سب سپاہِ شام
یوں ڈوب کر نکلتا تھا وہ آسماں مقام
ظاہر ہو جیسے ابر میں چھپ کر مہ تمام
موجیں تھیں رو ذیل کی فوجوں کا دل نہ تھا
پرواہ رے حواس کہ ابرو پہ بل نہ تھا

مشہور ہے کہ ایک پہ بھاری ہیں دو بشر
در پے تھے اک جوان کے لیے لاکھ اہلِ شر
کھاتے ادھر سے زخم جو کی اس طرف نظر
کس کس کا وار رد کریں دیکھیں کدھر کدھر
جب دم لیا تو سینہ پہ سو تیر چل گئے
پہلو کو توڑ توڑ کے نیزے نکل گئے

سینہ سپر تھا مشک پہ جھکے ہوئے تھے ڈھال
لڑنے میں بھی حسینؑ کے بچوں کا تھا خیال
کہتا تھا ڈگمگا کے فرس پر وہ خوش خصال
فرزند کو سنبھالیے یا شیرِ ذوالجلال

جا پہونچوں مشک لے کے جو تھوڑی سی راہ ہو
ایسا نہ ہو کہ پیاسوں کی کشتی تباہ ہو

یہ کہتے تھے کہ ٹوٹ پڑا لشکرِ شریر — بس چور ہو گیا پسرِ شاہِ قلعہ گیر
آکر لگا میانِ دو ابرو جو ایک تیر — تیورا گیا علیؑ ولیِ کا مہِ منیر
چھوٹی جو باگ پاؤں فرس کے بھی رک گئے
پھیلا کے ہاتھ مشکِ سکینہؑ پہ جھک گئے

سوالات

(۱) انیس کے کلام کی خصوصیات بیان کیجیے۔
(۲) انیس نے اردو پر کیا احسان کیا۔
(۳) کیا مرثیوں سے منظر نگاری اور ڈرامہ کی کمی پوری ہو سکتی ہے؟

مرزا سلامت علی دبیر

آپ کا اسم شریف مرزا سلامت علی۔ تخلص دبیر اور باپ کا نام مرزا غلام حسین تھا۔ آپ کے جدِ اعلیٰ ملا ہاشم علی شیرازی شاعر تھے جو ملا اہلی شیرازی صاحبِ مثنوی سحرِ حلال کے بڑے بھائی تھے۔ ملا ہاشم کے صاحبزادے مرزا رفیع متخلص بہ رفیع۔ اور خود ملا ہاشم بھی شاہانِ دہلی کے میر منشی سلطنت ہندوستان تھے۔ اسی طرح آپ کے دوسرے قریب عزیز اور بزرگ بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز تھے۔ مرزا صاحب کے والد ماجد سنہ ۱۱۹۰ھ میں دہلی ہی میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں خوش اوقاتی کے ساتھ زندگی گذارتے رہے۔ مگر دلی میں طوائف الملوکی کا دور

دیکھ کر دلّی سے برداشتہ خاطر ہو کر لکھنؤ چلے آئے۔ اور یہیں آ کر شادی کی۔ شادی کے بعد جب دلّی میں کسی قدر اطمینان ہوا تو پھر دلّی چلے گئے۔ یہیں ۱۱ رجادی الاولیٰ ۱۲۱۸ھ کو محلّہ بلّی ماراں میں وفات ہوئی۔ اور یہیں آپ کے بڑے بھائی مرزا غلام محمد متخلص بہ نظیر اور دو بہنیں عالم وجود میں آئیں۔ مگر لکھنؤ کی خاک نے ایسا دامن پکڑا کہ پھر وطن مالوف میں جی نہ لگا۔ سات آٹھ برس دلّی میں رہ کر پھر لکھنؤ چلے آئے اور مستقلاً یہیں رہنے لگے۔

مرزا صاحب نے ابھی علمی دنیا میں قدم رکھا ہی تھا۔ اور معمولی تعلیم و تربیت ہوئی تھی کہ بارہ تیرہ برس کی عمر میں آپ کو شعر و شاعری کا ذوق پیدا ہوا اور شعر کہنے لگے۔ اوّل اوّل مناقب بزرگان دین اور منقبت لکھتے رہے۔ ان کے والد مغفور کو اس کا علم ہوا تو اُستاد زمانہ میر ضمیر مرحوم کی خدمت میں اُنھیں لے گئے۔ اور شاگرد کرا دیا یہ ۱۲۳۰ھ کا واقعہ ہے۔ تیز طبیعت اور ہونہار دیکھ کر میر ضمیر نے دل لگا کر اصول شعر سے واقف کیا۔ اصلاح دی۔ اور چند روز بعد یہ اس قابل ہو گئے کہ اُستاد بھی ان کو ماننے لگے۔ جو مرثیے وغیرہ اصلاح کو آتے پہلے مرزا صاحب کے حوالے کر کے کہتے کہ میاں دبیر تم پہلے ان کو دیکھ کر عیوب سے پاک کر دو۔ ایک مرتبہ یہ دیکھتے۔ پھر نظر ثانی میر صاحب کر دیتے۔ اور کلام میں مئے دوآتشہ کی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ یہ سب کچھ تھا مگر مرزا صاحب کا سلسلۂ تعلیمی بھی جاری تھا۔ اور وہ برابر علوم رسمیہ اور ضروری منطق، فقہ، حدیث، اصول حدیث، صرف و نحو، ادب کی تکمیل کر رہے تھے۔

تا اینکہ سولہ سترہ برس کی عمر میں ان کی کافی شہرت ہو گئی۔ اور ضمیر، خلیق، فصیح کے ساتھ ان کا نام بھی لیا جانے لگا۔ اور اس شہرت کے ایسے بال و پر لگے کہ اڑتی ہوئی خبر حکمران لکھنؤ نواب غازی الدین حیدر کے کانوں تک گئی۔ اور انھوں نے مرزا صاحب کو اپنے عزاخانے میں بلا کر سنا۔ پہلے آپ نے کچھ رباعیاں پڑھیں پھر یہ مرثیہ شروع کیا۔

واجب ہے حمد و شکر جناب الٰہ میں ... فضل خدا سے آیا ہوں کس بارگاہ میں
مجھ سا گدا اور انجمن بادشاہ میں ... چرچا یہ لوگ کرتے ہیں اسوقت راہ میں

ذرّے پہ چشم مہر ہے مہر منیر کو
حضرت نے آج یاد کیا ہے دبیر کو

پھر تو شہرت ہوتے ہوتے وہ رنگ ہوا کہ ہر مجلس میں قدر دانوں کی نگاہیں انتظار کرتی اور بچھی جاتی تھیں۔ محلّات میں اکثر بیگمیں اور شہزادیاں بھی آپ ہی کی شاگرد ہو گئیں۔ اس پر حاسدوں کا ایسا حسد بڑھا کہ استاد اور شاگرد میں ناچاقی کرانا چاہی۔ مگر یہ تدبیر کچھ کارگر نہ ہوئی پھر بھی حاسدوں کی دشمنی ترقی کرتی رہی۔ اور اب نوبت یہ پہونچی کہ میر ضمیر کے دوسرے شاگرد مرزا صاحب پر حملے کرتے رہے اور مرزا صاحب نہایت نرمی سے سب کا جواب دیتے رہے۔

۱۲۵۸ھ میں میر انیس فیض آباد سے لکھنؤ آئے یہ امجد علی شاہ کا زمانہ تھا۔ اور مرزا صاحب کی شہرت اطراف و جوانب میں پھیلی ہوئی تھی مگر چونکہ میر مستحسن خلیق کے بہت سے شاگرد لکھنؤ میں تھے اس لیے میر انیس بھی بہت جلد مشہور ہو گئے۔ تا اینکہ دونوں باکمالوں کو حریف اور مدِّ مقابل مانا جانے لگا۔ اور اس فرقہ پرستی اور طرفداری کا وہ جوش

ہوا کہ لکھنؤ میں دو پارٹیاں ہوگئیں جن میں ایک کا نام انیسیہ اور دوسری کا دبیریہ ہوگیا جو اس وقت تک قائم ہیں۔ باانیکہ مفتی میر عباس صاحب نے عشرۂ کاملہ میں انیس و دبیر کی نسبت یہ فیصلہ بھی کر دیا ہے۔ کہ" دونوں صاحبوں کا مذاق جُدا جُدا ہے ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ میر صاحب کا کلام فصیح و شیریں ہے اور مرزا صاحب کا دقیق و نمکین"۔

۱۲۹۱ھ میں مرزا صاحب کی بصارت زائل ہوگئی۔ مگر اتفاق سے اُسی زمانہ میں کوئی ماہرِ چشم ڈاکٹر کلکتے میں واجد علی شاہ مرحوم کا ملازم ہوا تھا۔ بادشاہ نے ان کو بُلوایا اور علاج کرایا جس سے ان کی بینائی پھر درست ہوگئی۔

جب تک کہ سلطنت لکھنؤ میں قائم رہی۔ امرا میں دولت کی اور قدردانی کی افراط رہی مرزا صاحب کو لکھنؤ سے باہر جانے کی ضرورت نہ ہوئی مگر غدر ۱۸۵۷ء کے دو برس بعد پٹنہ عظیم آباد نواب امام باندی بیگم صاحبہ کی طلب پر پٹنے تشریف لے گئے اور پھر تاحینِ حیات وہاں جاتے رہے۔ آخر ۲ر محرم ۱۲۹۲ھ کو لکھنؤ میں انتقال فرمایا۔ اور اپنے مکان میں مدفون ہوئے۔ اب بھی محلّہ نخّاس میں آپ کا کوچہ مرزا دبیر میں مکان موجود ہے جہاں آپ کے پوتے مرزا رفیع صاحب سکونت پذیر ہیں۔

مرزا صاحب نہایت نیک نفس۔ وضعدار۔ درویش سیرت۔ باذل و کامل انسان تھے۔ آپ کے کلام میں بلاغت۔ استعارات میں رنگینی۔ آورد میں آمد کی شان۔ روانی برجستگی سبھی کچھ موجود ہے۔ اور ہر طریقے سے اس قابل ہے کہ اس کو بنظرِ امعان دیکھا جائے۔ اصنافِ کلام میں

رباعیاں اور مختلف چیزیں ہیں مگر رباعیات اور مرثیے خصوصیت رکھتے ہیں۔ ذیل میں ایک مرثیہ انتخاباً درج ہے۔

پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی پنہاں درازیٔ پرطاؤس شب ہوئی
اور قطع زلفِ لیلیٔ زہرہ لقب ہوئی مجنوں صفت قبائے سحر چاک شب ہوئی
فکر رفو تھی چرخ ہنرمند کے لیے
دن چار ٹکڑے ہو گیا پیوند کے لیے

فرہادِ چرخ تیشۂ دوراں نے ایک بار اس کوہ بے ستون فلک پر کیا قرار
فوراً لگا کے تیشۂ خورشید زرنگار کی جوئے شیرِ صبح سیاہی سے آشکار
پر شیر خوار آلِ پیمبر تڑپ گئے
منھ کھولا دودھ مانگا اور اصغر تڑپ گئے

یوسف فراقِ چاہ میں ناگہ نہاں ہوا یعنے غروب ماہ تجلّی نشاں ہوا
یونس دہانِ ماہیٔ شب سے عیاں ہوا یعنے طلوع نیّرِ مشرق ستاں ہوا
فرعونِ شب سے معرکہ آرا تھا آفتاب
دن تھا کلیم اور یدِ بیضا تھا آفتاب

تھی صبح یا فلک کا وہ جیبِ دریدہ تھا یا چہرۂ مسیح کا رنگ پریدہ تھا
خورشید تھا کہ عرش کا اشکِ چکیدہ تھا یا فاطمہ کا نالۂ گردوں رسیدہ تھا
کہیئے نہ مہر صبح کے سینہ پہ داغ تھا
امیدِ اہلبیت کا گھر بے چراغ تھا

روز سفید یوسفِ آفاق شب نقاب مغرب کی چاہ میں تھا جو وہ زیر ماہتاب
سقّائے آسماں نے لیا دلو آفتاب اور ریسمان شعاع کی باندھی بآب و تاب

یوسف کو دلو مہر میں نکلا کے چاہ سے
کھینچا تو اج شرق میں مغرب کی راہ سے

نکلا اُفق سے عابد روشن ضمیر صبح
محراب آسماں ہوئی جلوہ پذیر صبح

کھولا سپیدی نے جو مصلّائے پیر صبح
پر سجدہ گاہ بن گئی مہر منیر صبح

کرتی تھی شب غروب کا سجدہ درود کو
تیارے ہفت عضو بنے تھے سجود کو

ظلمت جہاں جہاں تھی وہاں نور ہوگیا
پھر مشک شب جہاں سے کافور ہوگیا

گویا کہ زنگ آئینہ سے دور ہوگیا
باطل رسالۂ شب دیجور ہوگیا

کیا پختہ روشنائی تھی قدرت کے خامے میں
مضموں آفتاب تھا ذرّوں کے نامے میں

جوز اعنانوں کے ہوئے جولاں جو راہوار
تیار ہوئے سیر و تماشائے روزگار

تازی ہوئے جو صرف چراگاہ ایک بار
باقی نہ کہکشاں کی رہی کاہ زرنگار

برباد سبزۂ روش کہکشاں ہوا
پامال برج سنبلۂ آسماں ہوا

شیران شیر حق تھے شریک ثواب صبح
سگ خصلتان شام تھے مشغول خواب صبح

پیش نگاہ تھا ورق انتخاب صبح
اور اس ورق پر مصحف نور آفتاب صبح

شان نزول سورۂ والفجر یاد تھی
مشتاق بہشت تھی فکر جہاد تھی

کھولے ہوا میں طائر زریں نے بال و پر
بیٹھا وہ آکے چرخ چہارم کے بام پر

دانے ستاروں کے جو پڑے تھے اِدھر اُدھر
منقار زر میں چن لیے اُس نے وہ سر بسر

پھر میہمان چشمۂ مہتاب ہو گیا
چشمہ تو خشک اور وہ سیراب ہو گیا

پر تھا ہمائے اوجِ سعادت شکستہ بال — جز اشکِ آب و دانہ کا تھا دیکھنا محال
تھا پیاس سے سکینہؑ و اصغرؑ کا غیر حال — مُنھ زرد ہونٹھ اور زباں سوکھی آنکھ لال
وہ دودھ دودھ کہتا تھا رو کر اشارے سے
یہ پانی پانی کہتی تھی زہرا کے پیارے سے

تھے خرمنِ فلک پہ ابھی دانۂ نجوم — بونے لگا جو تخمِ ستم ابنِ سعدِ شوم
غلّے کے باٹنے کی ندا دی علی العموم — مانندِ مور دانہ زدوں نے کیا ہجوم
غلّہ یہ سب قضا نے پئے اشقیا لکھا
اک دانہ پر بھی نام نہ شبّیر کا لکھا

دو ہاں ظالموں نے زمیں پہ بچھا دیے — حصّے عمرو نے دے کے برابر لگا دیے
اور افسروں کو بدرے کے بدرے اُٹھا دیے — پھر سر بمہر صرّۂ زر بھی دکھا دیے
لب کھولے جو فروشی و گندم نمائی میں
ہاں اے دلیرو جان لڑانا لڑائی میں

ہاں اے نمک حلالو نہ ہمّت کو ہاریو — بھوکے کو بھوکا پیاسے کو پیاسا ہی ماریو
ابنِ معاویہ کی خلافت سنواریو — سیّد کے سر کو سینے پہ چڑھ کر اُتاریو
ہے آج غلّہ کل زر و جاگیر مال ہے
شبّیر کو جو ذبح کرو سب حلال ہے

زینبؑ نے رفتہ رفتہ جو یہ شور سُن لیا — بیساختہ حسینؑ کے فاقے پہ رو دیا
جنگل کو رُخ کیا کبھی یثرب کو رُخ کیا — آواز دی کہاں ہو تم اے فخرِ انبیا

قربان جاؤں قبر میں اس شب کو سوتے ہو
! کربلا میں اپنے نواسے کو روتے ہو

نانا یہ کلمہ گو ہمیں ناحق ستاتے ہیں — پیتے ہیں خود ہمیں نہیں پانی پلاتے ہیں
انصاف کیلیے نہیں کیوں آپ آتے ہیں — اتنا تو پوچھیے یونہیں مہماں بلاتے ہیں

غلّہ سپاہِ شام میں تقسیم ہوتا ہے
کنبہ تمہارا تیسرے فاقے سے روتا ہے

سجادے پر کہیں تھے امام فلک مکاں — تقسیم غلّہ کا جو ہوا شور ناگہاں
ارزاں دیا رفیقوں کو وہ غلّۂ گراں — جس غلّہ گراں کے تھے نودلنے آسماں

گندم کے بدلے جنّتِ آدم میں گھر دیا!
گھر کیا کہ کائنات کا مختار کر دیا!

واں غلّہ لیکے سب سے مخاطب ہوا عمر د — کھالو کہ اب غذا نہ ملے گی کئی پہر
اس جنگ میں ہراس و تردد ہے سر بسر — ایماں کا نقص جان کا خوف آبرو کا ڈر

اُمّت سے سامنا ہے امام جلیل کا
کاٹا ہے جس کے باپ نے پر جبرئیل کا

ایک ایک انمیں حمزۂ صاحبقراں ہے آج — بندہ حسینیوں کا ہے جو پہلواں ہے آج
اک اک علی کیطرح شجاعِ جہاں ہے آج — شہرہ نہیں انکی تیغ کا سدگر داں ہے آج

ہاں صبح ہے قریب نہ کھانے میں دیر ہو
ان بھوکے پیاسے شیروں سے لڑنا ہی سیر ہو

بڑھ کر عمر و سے کہنے لگے بانیٔ ستم — اپنی تو یہ غذا ہے کہ بھوکے رہیں جو ہم
نوفل پکارا سیر ہیں آب و غذا سے ہم — کھائی ہے آج قتل عمدار کی قسم

چلّایا شمر ہم تو اُسی وقت کھائیں گے
جب تین دن کے پیاسے کا سر کاٹ لائیں گے
بولا عمرو کہ بیٹھو یہ باتیں روا نہیں
مُنھ کا نوالا شیروں کا سر کاٹنا نہیں
دعوٰے بے سند سے تمھیں کچھ حیا نہیں
رستم بھی بھوکا پیاسا کسی سے لڑا نہیں
اُترے نہ ہوتے تم جو لبِ نہرِ چین سے
پھر دیکھتا میں لڑتے ہو کیونکر حسینؑ سے

یہ جو کہا عمرو نے وہ چپکے چلے گئے
بے عقل نقدِ دیں عوض جنس دے گئے
سیّد کے قصد ذبح پر سب غلّے لے گئے
اور یاں عمرو کے اسپ عراقی کسے گئے
چیدہ کیے عمرو نے سلح کارزار کے
ظالم لے آئے چرخ سے تیغیں اُتار کے

سجنے لگا سلاح وغا پھر وہ پرُ دغا
کی خود خود نمائی سے زیب سرِ جفا
یا ماہ و آفتاب کو گویا گہن لگا
یا دار قد پہ کفر کا بخت سپر چڑھا
اسلام میں جو ڈالے تھے رخنے یزید نے
ان رخنوں کو کیا زرہ عمرو پلید نے

پاؤں میں پہنے موزۂ گمراہی جہاں
کج فہمی سے معاویہ کی اُس نے لی کماں
اور تیغ ہند ہندِ جگر خوار کی زباں
فرد سپر تھی نامۂ اعمال شامیاں
چار آئینہ وہ زنگ بھرا اُس پلید کا
دل شمر و شیث و ابن زیاد و یزید کا

نیزہ سنان ابن انس کا تھا دستِ جور
یہ نیزہ اور حسینؑ کا سینہ مقام غور
ترکش بھی تھا دریدہ دہن حرملہ کے طور
گویا سوا سے تیر نہ اس کی زباں تھی اور

اوّل خدنگ اُس کا چلے شاہِ خلق پر
آخر کو تیر حرملہ اصغر کے حلق پر

پھر زہر کے بجھے ہوئے خنجر طلب کیے — اپنے ملازموں پہ وہ تقسیم سب کیے
سامان میہمانیٔ شاہِ عرب کیے — ٹکڑے نبی علی کے جگر بے سبب کیے
مانگا شقی نے توسنِ زرّیں لجام کو
کھا پی کے فوج بھی ہوئی حاضر سلام کو

کثرت پہ فوج کی ہوا نازاں وہ خود پرست — بولا کہ اپنی فتح ہے شبیر کی شکست
پہلے کیا فرات کا ظالم نے بندوبست — بٹھلائے دس ہزار زرہ پوش تیز دست
دیوار آہنی لبِ دریا بلند کی
دریا نے بانگِ ہائے حسینا بلند کی

گھاٹوں کو روک کر یہ پکارا کہ ہاں سنو — بے آبرو کروں گا نہ مانے گا حکم جو
پائیں نہ ایک قطرہ شہنشاہ نیک خو — میّت کے غسل کو نہ وضو کو نہ پینے کو
جانبر نہ تشنگی سے امام حجاز ہو
خشکی میں غرق آلِ نبی کا جہاز ہو

اور سترہ ہزار سواران نیزہ دار — قوم اسد کے گھیرنے کو بھیجے ایک بار
یعنی بنی اسد اسد اللہ پہ ہیں نثار — ایسا نہ ہو کہ آئیں سوئے شاہ نامدار
اُن سے جدا حسینؑ رہیں وہ حسینؑ سے
ہم سیّدوں کو ذبح کریں رن میں چین سے

چیدہ کیے ہزار جوانانِ ناخلف — اس عہدے پر کیا اُنھیں منصوب ہر طرف
ساغر بکف رہیں وہ تنک ظرف صف بصف — جب العطش کہیں دُرِ پاکِ شہ نجف

پانی انھیں دکھا کے یہ بے آبرو بہائیں
پانی بہا کے تشنہ لبوں کا لہو بہائیں

چالیس سو پھر اُس نے کماندار رو سیاہ   بٹھلائے چار گوشوں میں گردِ خیامِ شاہ
سادات کے لیے نہ رکھا گوشۂ پناہ   روحِ بتول کہتی تھی رو رو کے آہ آہ
جلّاد لاکھ تیغوں سے اک سر اُتاریں گے
ناچار کر کے یہ مرے بچّے کو ماریں گے

القصّہ بندوبست یہ جب کر چکا عمرو   انعام دے کے پیکوں سے بولا وہ بدگہر
ہاں اب گھڑی گھڑی کی مجھے لا کے دو خبر   نکلیں اُدھر حسین تو ہو صف کشی ادھر
سُنتا ہوں آن بان یہ سادات مرتے ہیں
دیکھوں تو مورچے کہاں شبّیر کرتے ہیں

شبخوں ابھی نہ روز نے مارا تھا رات پر   جو اہلِ شام بیٹھ چکے یاں فرات پر
بلوا کیا عدو نے شہِ نیک ذات پر   ظلمت محیط ہو گئی آبِ حیات پر
شب کیا گئی نصیب کا کچھ پھیر ہو گیا
ہوتے ہی صبح خیمہ میں اندھیر ہو گیا

کھینچوں مرقعِ سحرِ شاہ خاص و عام   جیسے حضورِ صبح عمرو کی تھی عینِ شام
واں تو یہ دھوم دھام تھی اور یاں خدا کا نام   تسبیحِ فاطمہ ہی ابھی پڑھتے ہیں امام
واں کلمہ کفر کا یہاں شکر غفور کا
واں جادہ نار کا یہاں سجّادہ نور کا

کیا رو سفید فوجِ خدا ہے ظہورِ صبح   آتی ہے اُنکے عقدِ عبادت میں حورِ صبح
رُخ سے طلوعِ مہر جبیں سے ظہورِ صبح   اک سمت انکا نور تھا اک سمت نورِ صبح

سر سجدے میں بدن ہے قعود و قیام میں
کیا صبح کی بہار ہے فوجِ امام میں

آواز ارکبوا جو ملائک سناتے ہیں غازی نماز پڑھ کے مصلّے اٹھاتے ہیں
تعقیب کی دعائیں مگر پڑھتے جاتے ہیں سجدہ کو آستانہ مولا پہ آتے ہیں

در پر رکھے جبینوں کو سب خوشخصال ہیں
اک آسماں ہے اور بہتّر ہلال ہیں

مثلِ قمر یہ عابدِ شب زندہ دار ہیں مانندِ مہر متقی روزگار ہیں
شکلِ فلک رکوع میں لیل و نہار ہیں مثلِ زمیں سجود میں یہ خاکسار ہیں

سبحہ کی انکے ہاتھ سے کیا قدر بڑھتی ہے
تسبیح ان کے ہاتھ میں تسبیح پڑھتی ہے

دیکھو خشوع کو تو ہو لرزاں بدن تمام پوچھو رجوع قلب تو دل ہو سوے امام
واقف نہیں یا ہو کہ کس شئے کا ہو یہ نام جس کو نماز کہتے ہیں وہ ہو یہ والسّلام

روشن ہو ان کا اوجِ عبادت جہان پر
سجّادہ ہے زمیں پہ نماز آسمان پر

صبر انکا ہمنشیں ہے قناعت مکان ہے حلم انکا ہے مزاج صداقت زبان ہے
نورِ خدا بدن ہے حسینؑ انکی جان ہے ہمّت انھیں کے ہاتھ کا اک امتحان ہے

فردوس انکا خلق ہے نوران کا خشم ہے
ایمان انکا دل ہے حیا ان کی چشم ہے

ہے دست بوس ایک کے شمشیر آبدار دُرِّ نجف کا سبحہ کسی کے گلے کا ہار
کوئی خیال حورِ شہادت سے ہم کنار کوثر پہ آنکھ ایک جری کی جواب دار

کہتے ہیں راہ حق میں شرف کی کمی نہیں
اس راہ میں جو خاک نہو آدمی نہیں

سمجھے ہیں نامرادی دنیا کو یہ مراد — دل انکا غم میں شاد ہو غم اُنکے دل میں شاد
ہر عضو میں ہو دل کیطرح سے خدا کی یاد — قرآن پڑھنا ختم ہے اُن پر دم جہاد
لڑنے میں دست و تیغ برابر تُلے ہوئے
خود رحل کے ہیں گود میں قرآں کھُلے ہوئے

لشکر میں ہے یہ اکبرؑ و عباسؑ کا وقار — وہ انجمن میں شمع تو یہ باغ میں بہار
آنکھوں میں وہ نگاہ تو یہ سینوں میں قرار — وہ بازوؤں میں زور یہ قبضے میں ذوالفقار
ان دونوں کی یہ فوج خدا میں مثال ہے
دریا میں وہ گہر ہے یہ معدن میں لال ہے

وہ چشم ہو پلک میں تو یہ تل ہے سینے میں — حیدر وہ کعبے میں یہ پیمبر مدینے میں
یوسف وہ خطبے میں یہ سکندر نگینے میں — آب بقا وہ چشمے میں یہ زر خزینے میں
وہ آب موتیوں میں یہ اک گل ہزاروں میں
خوشبو وہ پھولوں میں یہ تجلی ستاروں میں

ہر صبح مہر و ماہ کی تو کم ہے روشنی — پر دیکھو انکے عارضوں کی جلوہ افگنی
خورشید وہ جری ہو تو ہے چاند یہ غنی — اک سمت کو ہو دھوپ اور اک سمت چاندنی
پائی نہ ماہ نے یہ ضیا ماہتاب میں
دیکھی نہ آفتاب نے یہ دھوپ خواب میں

والشمس سے رسول خدا ہیں مراد رب — اس شمس کی شعاع ہو اکبرؑ کے رُخ میں سب
عباسؑ کا ہے ماہ بنی ہاشمی لقب — دو دو رہیں اُنکے مہر و عطا کی یہ روز و شب

ہر صبح و شام روئے خلائق پہ باز ہیں
ذرّہ نوازوہ ہیں یہ اختر نواز ہیں

عباسؑ سے یہ کہتے ہیں اکبر کہ کیوں چچا
کیا ہوگا گر دخیمہ بھی ہے لشکرِ جفا
امّاں کے پردے کا مجھے اندیشہ ہے بڑا
باندھیں گے اپنا مورچہ ہم بھی پئے وغا
خیمے سے فاصلہ نہ پدر سے جدائی ہو
یہ طور ہو اگر تو بخوبی لڑائی ہو

امّاں نے کہہ دیا ہو کہ بخشوں گی میں نہ شیر
جیتے ترے امام کو نیزہ لگا کہ تیر
حافظ رہوں گا باپ کا میں وقت دار و گیر
لیکن غضب ہو والدہ گر ہو گئیں اسیر
خیر اب تو دامنِ شہِ خوشخو نہ چھوڑیں گے
جو ہو سو ہو حسینؑ کا پہلو نہ چھوڑیں گے

عبّاسؑ مدح کرتے ہیں گردن ہلا ہلا
زینب کے پالنے کی یہ غیرت ہو میں فدا
وہ پوچھتے ہیں اب کہیں ہے اور ارادہ کیا
یہ ہاتھ مُنھ پہ پھیر کے کہتے ہیں دیکھنا
جینے سے ہاتھ اُٹھاتے ہیں مرد اپنی بات پر
اپنا تو آج مورچہ ہوگا فرات پر

کہتے ہیں جھوم جھوم کے زینب کے یادگار
اک حملہ میں سمند رہیں اپنے بھی پلّے پار
ابنِ حسنؑ کے حسنِ بیاں سے ہے آشکار
ازرق کا زرق برق مٹادوں تو ہو قرار
دعوے ہیں آج حیدریوں کو بڑے بڑے
چاہیں تو غرب و شرق کو لے لیں کھڑے کھڑے

کیونکر نہ شیر ہوں خلفِ شیرِ کبریا
سیدانیوں کا دودھ ہے ان پیاسوں نے پیا
دو دن سے ایک لقمہ تناول نہیں کیا
لیکن وہی ہے چہرے کی سُرخی وہی ضیا

سید ہر ایک حال میں خوشحال رہتے ہیں
کھائیں نہ کھائیں شیروں کے منھ لال رہتے ہیں

دنداں بہادروں کے کجا اور دُر کجا
لکھے ہیں حرفِ دُر کے پریشاں جدا جدا
دنداں ملے ہوئے ہیں جدائی نہیں ذرا
پاسِ ادب سے دور ہو گران کو دُر کہا
تو دُر کے کان چھدنے سے گذرا یہ دھیان میں
دنداں کا یہ یتیم ہے بندہ جہان میں

رُخ چشمۂ حیات احبا کے واسطے
خط لب کا ذوالفقار ہو اعدا کے واسطے
فیض دہانِ تنگ ہو دنیا کے واسطے
یاں جائے دم زدن نہیں عیسیٰؑ کے واسطے
دُرجِ دہن کے دانتوں سے رتبے زیادہ ہیں
یہ وہ صدف ہے جس کے گہر خانہ زاد ہیں

مصحف اگر وہ رُخ ہو تو گیسو ہیں مشکبار
شیرازے کی طرح سے ہیں قرآں کے رشتہ دار
جلدِ کتابِ رُخ کی نزاکت پہ ہیں نثار
خط ہو کہ جلد سے خطِ مصحف ہو آشکار
ان کے شرف پہ عزم قسم کا کیے ہوئے
پھرتی ہو جلد ہاتھ میں قرآں لیے ہوئے

اور زلف حلقہ حلقہ ہے آرام کی جگہ
ظلمت ہو جیسے خضر خوش انجام کی جگہ
اس لام کا ہے دائرہ اسلام کی جگہ
یعنی علیؑ کے دل میں ہو اس لام کی جگہ
یہ زلف و رُخ وہ دفترِ قدرت نگار ہے
اک بیت اس رسالہ کی لیل و نہار ہے

پلکوں کے نیچوں سے زبردست زیر ہیں
یاں زندگی سے ہمدم خونخوار سیر ہیں
صید افگنی پہ چشم کے آہو دلیر ہیں
آہو نہیں ہیں بلکہ نیستاں کے شیر ہیں

غیرت سے آبدیدہ ہر اک شہسوار ہے
تیغ نگہ سنان مژہ آب دار ہے

سینہ نگین خاتم ایجاد کبریا — کندہ ہے اس پہ نقش غلامی مرتضےٰ
زیر نگیں ہے دل کی طرح کشور وفا — ہیں ان کے حوصلہ پہ فدا از در پر فدا
ہر اک کے کام آتے ہیں یہ کام کی جگہ
سینہ سپر ہیں مثل سپر نام کی جگہ

جو نور سب کی آنکھ میں ہو انکے تن میں ہو — تار نگاہ ناز ہر اک پیرہن میں ہے
روشن ہر ایک آنکھ زرہ کے بدن میں ہو — دیکھو مبالغہ نہیں میرے سخن میں ہے
تن کی ضیا قرار جو حلقوں میں لیتی ہے
پتلی زرہ کی آنکھوں میں دکھلائی دیتی ہے

کیا پیرہن کی زیب ہے کیا اسلحہ کی سج — چار آئینہ ہے صوم و صلوٰۃ و زکوٰۃ و حج
سیدھی نہیں کسی سے بجز فتح تیغ کج — قامت ہو خم پہ چلنے میں مطلق نہیں ہے حرج
جوہر ہنر پہ تیغ کے قرآں اُٹھاتے ہیں
قبضہ پہ مدعی قسم راست کھاتے ہیں

ان کے عقاب تیر کا ہو مرغ جاں شکار — طائر کوئی اُڑے نہ مع شاخ زینہار
پر ہر بد خدنگ ہیں انکے وہ زور دار — اُڑتے ہیں پھل بھی شاخ کے ساتھ انکے بار بار
تا پیش ویں نہ آسے عدو قصد گشت پر
اک چشم تیر آگے ہے اک چشم پشت پر

باندھے کمر جہاد پہ خود لیس ہے کماں — غصے سے ایک پوست ہے بالائے استخواں
یہ قوس وہ ہو قوس قزح جنکی مدح خواں — نیزہ سے نیزہ باز فلک طالب اماں

اس نیزے سے مباحثے کی کس کو تاب ہے
گویا زباں کی طرح یہ حاضر جواب ہے

ڈھال اُنکی ہو وہ بدر کہ اکثر دمِ جدال
اس بدر سے تراشے ہیں تیغوں نے سو ہلال
پھر ہے جہاد میں یہ وہی بدر بے زوال
حقا وہ حق پہ لڑتے ہیں ہیں جو کہ خوشخصال
پس اُن کی پُشت پر یہ سپر کی دلیل ہے
پُشت و پناہ کعبۂ ربّ الجلیل ہے

دریا دلوں کے گھوڑے ہیں یا کشتی رواں
کشتی کا نقش پا نہیں پانی کے درمیاں
ان تازیوں کے سُم کے زمیں پر نہیں نشاں
انجیل میں ہو ان کی فضیلت کا یہ بیاں
قطرہ عرق نہ سوکھے گا اُن راہواروں کا
جو داخلہ بہشت میں ہو گا سواروں کا

مضموں ہو سُست کیوں نہ قدم نظم لنگ ہے
شوخی سے ان سمندوں کی شوخی بھی دنگ ہے
میدانِ ردیف و قافیہ کا ایسا تنگ ہے
جلدی ہوا کی سامنے ان کے درنگ ہے
دریا میں یہ نہنگ ہیں ضیغم مصاف میں
حوریں ہیں یہ بہشت میں پریاں ہیں قاف میں

طاؤس اُنکا جلوہ ہو کبک اُنکا ہے خرام
سر اُنکا پنجہ اور ہرن چشم مشک فام
حور اُن کی پتلیاں ہیں پری ہے پلک کا نام
بجلی بدن ہو ان کا شرر ہیں رگیں تمام
سیماب ہے پسینہ نسیم ان کی جان ہے
رعد اُن کا ایک نعرہ ہے شعلہ زبان ہے

ناگاہ خیمہ گاہ سے شورِ بُکا اُٹھا
سجادہ سے نمازیٔ خیر النسا اُٹھا
اور سبز پردہ درِ آلِ عبا اُٹھا
آواز آئی بانو کی وارث مرا اُٹھا

راضی سکینہ جان تیمی پہ ہو گئیں
پچھلے سے جاگتی رہیں اس وقت سو گئیں

کلثومؑ صبر کر چکی مظلوم بھائی کو
زینبؑ نے بھی لٹا دیا ماں کی کمائی کو
یا تو نے بھی قبول کیا بے ردائی کو
اب کون رو کے ہائے شہ کربلائی کو

عابدؑ نے کہہ دیا کہ رہِ کرد گار میں
ہم تازیانے کھائیں گے بابا بُخار میں

خدام تازی شہ غازی کو در پہ لائے
مولائے حلہ پوش کفن پہنے باہر آئے
اور چشم سے رکاب نے دونوں قدم لگائے
زینبؑ پکاری ہائے حسیناؑ غریب ہائے

تاریک چشم اہل حرم میں جہاں ہوا
زہراؑ کا چاند لے کے ستارے رواں ہوا

سوالات

(۱) انیس اور دبیر میں آپ کس کو پسند کرتے ہیں اور کیوں ؟

(۲) شبلی نے دبیر پر اعتراضات کیے ہیں۔ کیا وہ صحیح ہیں۔ موازنہ انیس و دبیر کو پڑھ کر جواب لکھیے۔

مزید مطالعہ کے لیے

(۱) شاہکار انیس (قادری)

(۲) سعیدی مقالات (زور)

(۳) المیزان ۔ موازنہ

مثنویات

مثنوی

اصطلاح میں مثنوی اُن اشعار کو کہتے ہیں۔ جن میں دو دو مصرع باہم مُقفّٰی ہوں۔ اور اس میں تعداد اشعار کی کوئی قید نہیں ہے۔ شعر کی تمام اصناف سے زیادہ اس میں گنجائش ہے اس لیے مثنوی کو بڑے بڑے مضمونوں، قصّوں، تصوّف، اخلاق اور حکمت و مواعظ کے بیان رزمیہ حالات و تاریخ رزم لکھنے کے لیے منتخب کرلیا ہے۔ اور اس میں ہر قسم کے قصّے نظم کیے گئے ہیں۔ اس کے موجد اہل ایران ہیں دوسری زبانوں میں اس کی مثال نہیں ہے۔ اساتذہ نے سات بحریں اس کے لیے مخصوص کردی ہیں۔ اور زیادہ تر انھیں میں مثنویاں کہی گئیں اور اُن کے علاوہ بحروں میں مقبول نہیں ہوئیں۔ چنانچہ میر حسن مرحوم کی مثنوی سحرالبیان بحر متقارب مثمن محذوف الآخر میں یا بحر ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف الآخر یا مقصور الآخر جس میں نسیم کی مثنوی گلزار نسیم ہے۔ یہ دونوں بحریں اُنھیں سات بحروں میں سے ہیں۔

مثنوی کی صنف زبان اُردو میں قدیم سے چلی آتی ہے اور

اس وقت تک شعرا اس صنف میں مشق سخن کرتے ہیں۔

میر حسن

نام غلام حسن۔ تخلص حسن۔ میر ضاحک کے بیٹے اور دلّی کے رہنے والے تھے۔ ان کے جدِّ اعلیٰ میر امامی ہرات سے آئے اور پُرانی دلّی میں مقیم ہوئے۔ یہیں میر ضاحک کی ولادت ہوئی۔ جو ایک ہنسوڑ گم نامور شاعر ہوئے۔ میر ضاحک دہلی ہی میں تھے کہ محلّہ سیّد واڑہ میں ۱۱۴۲ھ میں میر حسن پیدا ہوئے اور یہیں اپنے والد سے تعلیم و تربیت پائی۔ اوائل سن شعور سے شعر و شاعری کا شوق دامن گیر ہوا۔ اوّل اوّل میں کچھ کلام باپ کو دکھایا۔ پھر خواجہ میر درد سے اصلاح لی اور پھر اکثر میر ضیا سے۔ اور کبھی کبھی مرزا سودا سے استفادہ سخن کرتے رہے۔ دلّی کی تباہی و بربادی سے روز سیکڑوں گھر اُجڑتے تھے۔ شرفا کوچ کر رہے تھے۔ میر ضاحک بھی نہ ٹھہر سکے اور وطن مالوف کو چھوڑ کر چند روز ڈیگ میں قیام کرتے ہوئے فیض آباد پہونچے۔ میر حسن بھی انھیں کے ساتھ فیض آباد آئے اور یہیں رہنے لگے۔ یہاں قدر دانِ کمال موجود تھے۔ چنانچہ یہ بھی نواب سالار جنگ برادر بہو بیگم صاحبہ کی ملازمت میں سرفراز ہو گئے۔ اور پھر اُن کے بیٹے مرزا نوازش علی خاں کے بھی چند روز مصاحب رہے۔ جب نواب آصف الدولہ ۱۱۷۵ھ میں سریر آرائے سلطنت ہوئے اور لکھنؤ مستقر الحکومت ہوا تو یہ بھی لکھنؤ آ گئے اور محرم ۱۲۰۱ھ میں انتقال کیا اُس وقت پچاس سے کچھ زیادہ

عمر تھی۔ مصحفی نے "شاعر شیریں بیاں" تاریخ کہی۔ عقب باغ قاسم علی خاں محلہ مفتی واڑہ میں مدفون ہوئے۔

میر حسن کا لکھنؤ آنا اور یہاں قیام کرنا اُن کی وقتی مصلحتوں پر مبنی ہوگا۔ ورنہ اصل یہ ہے کہ فیض آباد کے مقابلہ پر لکھنؤ میں اُن کا جی نہیں لگا اور وہ ہمیشہ اس جگہ سے متنفر رہے جیسا کہ اُن کی مثنوی گلزار ارم سے معلوم ہوتا ہے۔

جب آیا میں دیارِ لکھنؤ میں	نہ دیکھا کچھ بہار لکھنؤ میں
کیا تھا غم نے ازبس دل پہ ڈیرا	لگا اس جا پہ ہرگز دل نہ میرا

میر حسن نہایت زندہ دل۔ یار باش۔ ہشّاش بشّاش آدمی تھے چُست لباس۔ داڑھی مُنڈی ہوئی۔ آزاد روش۔ مذہباً شیعہ مگر تعصب کی قیود سے آزاد۔ چنانچہ گلزار ارم میں اُن کا شاہ مدار کے میلے میں جانا بھی ثابت ہے۔ اور اس میں جو رنگ رلیاں منائی ہیں وہ بھی ظاہر ہے۔

اُنھوں نے خود لکھا ہے کہ وہ میر ضیاؔ کے شاگرد ہوئے مگر اُستاد کی طرز کو نباہ نہ سکے اس لیے میر دردؔ۔ میر تقی میرؔ وغیرہ کے رنگ میں غزلیں کہتے رہے۔ اُن کے کلام پر مجموعی حیثیت سے نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے پختہ مشق۔ خوش گو۔ سخن سنج نقاد کا درجہ رکھتے تھے۔ اُن کی غزلوں میں میر سوزؔ کی صفائی اور معاملہ بندی۔ میر تقی میرؔ کا سوز و گداز۔ دردؔ کا عاشقانہ انداز بیان موجود ہے۔ قصیدے اگرچہ موجود ہیں مگر غزل کے درجے پر نہیں ہیں۔ پھر اُن کی شاعرانہ قدرت کلام کا نمونہ جس قدر اُن کی

مثنویوں سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کا غزل میں بھی پتہ نہیں مثنوی میر حسن موسوم بہ سحر البیان۔ و بے نظیر و بدرِ مُنیر اس بات کی شاہد ہے۔ کہ اُن سے بہتر مثنوی کہنے والا شاید اسوقت تک اُردو میں کوئی پیدا نہیں ہوا تھا۔ بیان کی صفائی۔ محاورہ بندی کی خوبی معاملہ بندی۔ جذبات وغیرہ کے علاوہ اُنھوں نے بڑا کمال یہ کیا ہے کہ ہر داستان اور ہر مضمون و بیان میں جزئیات کی تصویریں کھینچ دی ہیں۔ زبان اتنی صاف اور سلیس ہے کہ سَو برس گذر گئے اور وہ زبان اب تک نہیں بدلی۔ مولانا آزاد نے خوب لکھا ہے کہ "کیا اُسے سَو برس آگے والوں کی باتیں سُنائی دیتی تھیں۔ کہ جو کچھ کہا صاف۔ وہی محاورہ اور وہی گفتگو ہے جواب ہم تم بول رہے ہیں" ان کے طرز بیان سے پُرانے رنگ کا قصہ نیا معلوم ہوتا ہے۔ اور کسی حیثیت سے اس کی پوری تعریف نہیں ہو سکتی۔ یہ مثنوی سنہ ۱۱۹۹ھ مطابق سنہ ۱۷۸۵ء میں لکھی گئی۔

میر حسن کی دوسری مثنویاں اگرچہ سحر البیان کے درجے کو نہیں پہونچتیں مگر پھر بھی وہ بہت خوب ہیں۔ مثلاً مثنوی گلزار ارم جس میں اُنھوں نے شاہ مدار کی چھڑیوں کے میلے کی کیفیت نہایت عمدہ طور سے بیان کی ہے۔ اور اُس وقت کی رسوم کا تحریری نقشہ کھینچا ہے۔ ایک مثنوی رموز العارفین جس کا خود انھوں نے اپنے تذکرے میں ذکر کیا ہے۔ اور اب وہ بھی چھپ گئی ہے ان کے علاوہ اور بعض چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی ہیں۔ ایک تذکرہ

اُردو لکھنے والے قدیم شعرا کا میر حسن کے معاصرین تک ہے۔ اگرچہ اس میں مفصّل حالات سے بحث نہیں مگر نہایت کارآمد اور دلچسپ ہے۔ زبان فارسی ہے۔ اُردو کا کلام نمونے کے طور پر دیا ہے جا بجا ہلکی ہلکی تنقید بھی کرتے گئے ہیں۔

ان کے کلیات میں غزلوں کے دیوان کے علاوہ مرثیے۔ سلام بھی ہیں۔ جن کو صرف اُن کے عقیدے کی بنا پر جو چاہیں کہہ لیں ورنہ اصل یہ ہے کہ یہ صنفِ کلام خدا نے اُن کے پوتوں میر انیس مونس کے لیے محفوظ رکھی تھی۔

ذیل میں مثنوی سحرالبیان سے چند داستانوں کا انتخاب درج کیا جاتا ہے۔

داستان تیاری میں باغ کی

دیا شہ نے ترتیب اک خانہ باغ
ہوا رشک سے جس کے لالہ کو داغ

عمارت کی خوبی دروں کی وہ شان
لگے جس میں زربفت کے سائبان

چھتیں اور پردے بندھے زرنگار
دروں پر کھڑی دست بستہ بہار

کوئی دورسے در پہ اٹکا ہوا
کوئی زہ پہ خوبی سے لٹکا ہوا

وہ مقیش کی ڈوریاں سربسر
کمر کا بندھا جس میں تارِ نظر

چقوں کا تماشا تھا آنکھوں کا جال
نگہ کو وہاں سے گذرنا محال

سنہری مغرق چھتیں ساریاں
وہ دیوار اور در کی گلکاریاں

دیے ہر طرف آئنے جو لگا
گیا چوگنا لطف اُس میں سما

وہ مخمل کا فرش اُسکا ستھرا کہ بس
بڑھے جس کے آگے نہ پائے ہوس

رہیں تخلخلے اُس میں روشن مدام
معطر شب و روز جس سے مشام

چھپر کھٹ مرضع کا دالان میں
چمکتا تھا اس طرح ہر آن میں

زمین پر بھی اس طور اُس کی جھمک
ستاروں کی جیسے فلک پر چمک

زمیں کا کروں اُس کی کیا میں بیاں
کہ صندل کا اک پارچہ تھا عیاں

بنی سنگ مرمر کی چوپڑ کی نہر
گئی چار سو اُس کے پانی کی لہر

قرینے سے گرد اُس کے سرو سہی
کچھ اک دور دور اُس سے سیب و بہی

کہوں کیا میں کیفیت دار بست
لگائے رہیں تاک واں مے پرست

ہوائے بہاری سے گل لہلہے
چمن سارے شاداب اور ڈہڈہے

زمرد کے مانند سبزے کا رنگ
روش پر جواہر لگا جیسے سنگ

روش کی صفائی پہ بے اختیار
گل اشرفی نے کیا زر نثار

چمن سے بھرا باغ گل سے چمن
کہیں نرگس و گل کہیں یاسمن

چنبیلی کہیں اور کہیں موتیا
کہیں رائے بیل اور کہیں موگرا

کھڑے شاخ شبو کے ہر جا نشان
مدن بان کی اور ہی آن بان

کہیں ارغواں اور کہیں لالہ زار
جدا ہی اپنے موسم میں سب کی بہار

کہیں جعفری اور گیندا کہیں
سماں شب کو داؤدیوں کا کہیں

عجب چاندنی میں گلوں کی بہار
ہر اک گل سفیدی سے مہتاب دار

کھڑے سرو کی طرح چنپے کے جھاڑ
کہے تو کہ خوشبوئیوں کے پہاڑ

کہیں زرد نسریں کہیں نسترن
عجب رنگ کے زعفرانی چمن

پڑے آب جو ہر طرف کو بہے
کریں قمریاں سرو پر چہچہے

گلوں کا لب نہر پر جھومنا
اُسی اپنے عالم میں منھ چومنا

وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر
نشے کا سا عالم گلستان پر

لیے ہاتھ میں بیلچے مالنیں
کہیں تخم پاشی کریں کھود کر
کھڑے شاخ در شاخ باہم نہال
لبِ جو پہ آئینے میں دیکھ قد
خراماں صبا صحن میں چار سو
کھڑے نہر پر قاز اور قرقرے
صدا قرقروں کی بطوں کا وہ شور
چمن آتشِ گل سے دہکا ہوا
صبا جو گئی ڈھیریاں کر کے پھول
وہ کیلوں کی اور مولسریوں کی چھاؤں
خوشی سے گلوں پر سدا بلبلیں
درختوں نے برگوں کے کھولے ورق
سماں قمریاں دیکھ اُس آن کا
دوادائیاں اور مغلانیاں
خواصوں کا اور لونڈیوں کا ہجوم
تکلف کے پہنے پھریں سب لباس
کنیزانِ مہرو کی ہر طرف ریل
رنگیلی کوئی اور کوئی شام روپ
کوئی کیتکی اور کوئی گلاب
کوئی موتی اور ہنس مکھ کوئی
اِدھر اور اُدھر آتیاں جاتیاں

چمن کو لگیں دیکھنے بھالنیں
پنیری جماویں کہیں کھود کر
رہیں ہاتھ جوں مست گردن میں ڈال
اکڑنا کھڑے سرو کا جد نہ قد
دماغوں کو دیتی ہر اک گل کی بو
لیے ساتھ مرغابیوں کے پرے
درختوں پہ بگلے منڈیروں پہ مور
ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا
پڑے ہر طرف مولسریوں کے پھول
لگی جائیں آنکھیں لیے جس کا نانوں
تعشق کی آپس میں باتیں کریں
کریں طوطیانِ بوستاں کا سبق
پڑھیں یاب پنجم گلستان کا
پھریں ہر طرف اُس میں جلوہ کناں
محل کی وہ چہلیں وہ آپس کی دھوم
رہیں رات دن شاہزادے کے پاس
چنبیلی کوئی اور کوئی رائے بیل
کوئی چمپت لگن اور کوئی کام روپ
کوئی مہرتن اور کوئی ماہتاب
کوئی دل لگن اور تن سکھ کوئی
پھریں اپنے جوبن کو دکھلاتیاں

کہیں اپنے پٹّے سنوارے کوئی
کہیں چٹکیاں اور کہیں تالیاں
بجاتی پھرے کوئی اپنے کڑے
دکھا دے کوئی گوکھرو موڑ موڑ
ادا سے کوئی بیٹھی حقّہ پیئے
کوئی حوض میں جا کے غوطہ لگائے
کوئی اپنے طوطے کی لیوے خبر
کسی کو کوئی دھول مارے کہیں
کوئی آرسی اپنے آگے دھرے
مقابہ کوئی کھول مسّی لگائے
ہوا اُن گلوں سے دو بالا سماں
غرض لوگ تھے یہ جو ہر کام کے
پلا جب وہ اس ناز و نعمت کے ساتھ
ہوئی اُسکے مکتب کی شادی عیاں
معلّم اتالیق منشی ادیب
کیا قاعدے سے شروع کلام
دیا تھا زبس حق نے ذہن رسا
معانی و منطق بیان و ادب
خبردار حکمت کے مضمون سے
لگا ہیئت و ہندسہ تا نجوم
کیے علم نوکِ زباں حرف حرف

ارے او سہیلی پکارے کوئی
کہیں قہقہے اور کہیں گالیاں
کہیں واہ وا اور کہیں واچھڑے
کہیں سوت پونی کہیں تار توڑ
دم دوستی کا کوئی بھر بھر جیے
کوئی نہر پر پاؤں بیٹھی ہلائے
کوئی اپنی مینا پہ رکھے نظر
کوئی جان کو اپنی وارے کہیں
ادا سے کہیں بیٹھی کنگھی کرے
لبوں پر دھڑی کوئی اپنے جمائے
اُسی باغ میں تھا وہ سرو رواں
یہ سب واسطے اُس کی آرام کے
پدر اور مادر کی شفقت کے ساتھ
ہوا پھر اُنھیں شادیوں کا سماں
ہر اک فن کے اُستاد بیٹھے قریب
پڑھانے لگے علم اُس کو تمام
کئی سال میں علم سب پڑھ چکا
پڑھا اُس نے منقول و معقول سب
غرض جو پڑھا اُس نے قانون سے
زمیں آسماں میں پڑی اُسکی دھوم
اسی نحو سے اُس نے کی عمر صرف

عطارد کو آنے لگی اُس کی ریس — ہوا سادہ لوحی میں وہ خوشنویس
ہوا جبکہ نوخط وہ شیریں رقم — بڑھا کر لکھے سات سے نو قلم
لیا ہاتھ جب خامۂ مشکبار — لکھا نسخ و ریحان و خطِ غبار
عروس الخطوط اور ثلث و رقاع — خفی اور جلی مثل خط شعاع
شکست لکھا اور تعلیق جب — رہے دیکھ حیراں اتالیق سب
کیا خط گلزار سے جب فراغ — ہوا صفحۂ قطعہ گلزار باغ
کروں علم اُسکا کہاں تک بیاں — کہ ہے خوب اب مختصر یہ بیاں
کماں کے جو درپے ہوا بے نظیر — لیا کھینچ چلّے میں سب فن تیر
صفائی میں سوفار پیکاں کیا — کیا تودہ تودہ یہ طوفاں کیا
رکھا چھوٹتے ہی جو لکڑی پہ من — کیا اپنے قبضہ میں سب اُسکا فن
ہوئیں دست بازو کی سرسائیاں — اُڑائیں کئی ہاتھ میں گھائیاں
رکھا موسقی پر جو کچھ کچھ خیال — کیے قید سب اُس نے ہاتھوں میں تال
طبیعت گئی کچھ جو تصویر پر — رکھے رنگ سب اُس کے مدِّ نظر
کئی دن میں سیکھا یہ کسبِ تفنگ — کہ حیراں ہوئے دیکھ اہلِ فرنگ
سوا ان کمالوں کے کتنے کمال — مروّت کی خو آدمیت کی چال
رذالوں سے نفروں سے نفرت اُسے — سدا قابلوں سے تھی صحبت اُسے
گیا نام پر اپنے وہ دلپذیر — ہر اک فن میں سچ مچ ہوا بے نظیر

داستان سواری کی تیاری کے حکم میں

پلا ساقیا مجھ کو اک جام مُل — جوانی میں آیا ہے ایامِ گُل
غنیمت شمر صحبتِ دوستاں — کہ گل پنج روز است در بوستاں

ثمر ہے بھلائی کا گر ہو سکے
شتابی سے بولے جو کچھ ہو سکے

کہ رنگ چمن پر نہیں اعتبار
یہاں چرخ میں ہے خزان و بہار

پڑی جب گرہ بارھویں سال کی
کھلی گلجھڑی غم کے جنجال کی

کہا شہ نے بلوا نقیبوں کو شام
کہ ہوں صبح حاضر سبھی خاص و عام

سواری تکلف سے تیار ہو
مہیا کریں جو کہ درکار ہو

کریں شہر کو مل کے آئینہ بند
سواری کا ہو لطف جس سے دوچند

رعیت کے خوش ہوں صغیر و کبیر
کہ نکلے گا کل شہر میں بے نظیر

یہ فرما محل میں گیا بادشاہ
نقیبوں نے سن حکم لی اپنی راہ

ہوئی شب لیا مہ نے جام شراب
گیا سجدۂ شکر میں آفتاب

خوشی میں گئی جلد شب جو گزر
ہوئی سامنے سے نمایاں سحر

عجب شب تھی، وہ جوں سحر روز سپید
عجب سوز تھا مثل روز امید

گیا مژدۂ صبح لے ماہتاب
اٹھا سورج آنکھوں کو ملتا شتاب

کہا شاہ نے اپنے فرزند کو
کہ بابا نہا دھو کے تیار ہو

داستان حمام میں نہانے کی لطافتیں

پلا آتشیں آب پیر مغاں
کہ بھولے مجھے گرم و سرد جہاں

اگر چاہتا ہے مرے دل کو چین
نہ دینا وہ ساغر جو ہو قلتین

کدورت مرے دل کی دھو ساقیا
ذرا شیشۂ مے کو دھو دھا کے لا

کہ سر گرم حمام ہے بے نظیر
گیا ہے نہانے کو بدر منیر

ہوا جب کہ داخل وہ حمام میں
عرق آ گیا اس کے اندام میں

تن نازنیں نم ہوا اس کا کُل
کہ جس طرح ڈوبے ہے شبنم میں گل

پرستار باندھے ہوئے ٹکٹکیاں
مہ و مہر سے طاس لے کر وہاں

لگیں ملنے اُس گلبدن کا بدن
ہوا اڈہڑا آب سے وہ چمن

نہانے میں یوں تھی بدن کی دمک
برسنے میں بجلی کی جیسے چمک

لبوں پر جو پانی پڑا سر بسر
نظر آئے جیسے وہ گلبرگ تر

ہوا قطرۂ آب یوں چشم بوس
کہے تو پڑے جیسے نرگس پہ اوس

لگا ہونے ظاہر جو اعجازِ حسن
ٹپکنے لگا اُس سے اندازِ حسن

گیا حوض میں جب شہِ بے نظیر
پڑا آب میں عکسِ ماہِ مُنیر

وہ گورا بدن اور بال اُس کے تر
کہے تو کہ ساون کی شام و سحر

نمی سے تھا بالوں کا عالم عجیب
نہ دیکھی کوئی خوب تر اُس سے شب

کہوں اُس کی خوبی کی کیا تجھ سے بات
کہ جوں بھیگتی جائے صحبت میں رات

زمیں پر تھا اک موجۂ نور خیز
ہوا جب وہ فوارہ ساں آبریز

زمرّد کے لے ہاتھ میں سنگ پا
کیا خادموں نے جو آہنگ پا

ہنسا کھلکھلا وہ گلِ نوبہار
لیا کھینچ پانوں کو بے اختیار

عجب عالم اُس نازنیں پر ہوا
اثر گدگدی کا جبیں پر ہوا

ہنسا اس ادا سے کہ سب ہنس پڑے
ہوئے جی سے قرباں چھوٹے بڑے

دعائیں لگے دینے بے اختیار
کہا خوش رکھے تجھ کو پروردگار

کہ تیری خوشی سے ہے سب کی خوشی
مبارک تجھے روز و شب کی خوشی

نہ آوے کبھی تیری خاطر پہ مَیل
چمکتا رہے یہ فلک کا سہیل

کیا غسل جب اِس لطافت کے ساتھ
اُڑھا کھیس لائے اُسے ہاتھوں ہاتھ

نہا دُھو کے نکلا وہ گل اس طرح
کہ بدلی سے نکلے ہے مہ جس طرح

غرض شاہزادے کو نہلا دُھلا
دیا خلعتِ خسروانہ پنہا

جواہر سراسر پنہایا اُسے
کڑے کنگن اور کلغی اور نورتن
مرصّع کا سرپیچ جوں موجِ آب
وہ موتی کے مالے بصد زیب و زین
جواہر کا تن پر عجب تھا ظہور
غرض ہو کے اس طرح آراستہ
نکل گھر سے جس دم ہوا وہ سوار
زبس تھا سواری کا باہر ہجوم
برابر برابر کھڑے تھے سوار
سُنہری رو پہلی وہ عماریاں
چمکتے ہوئے بادلے کے نشاں
ہزاروں ہی اطراف میں پالکی
کہاروں کی زربفت کی کُرتیاں
بندھی پگڑیاں تاش کی سر اوپر
وہ ہاتھوں میں سونے کے موٹے کڑے
وہ ماہی مراتب وہ سر دروال
وہ شہنائیوں کی صدا خوشنما
وہ آہستہ گھوڑوں پہ نقارچی
بجاتے ہوئے شادیانے تمام
سوار اور پیادہ صغیر و کبیر
وہ نذریں کہ جس جس نے تھیں ٹھانیاں

جواہر کا دریا بنایا اُسے
کیا ایک سے ایک زیب بدن
منور بہ شکل رُخِ آفتاب
کہیں جس کو آرام جاں دل کا چین
کہ اک اک عدد اُس کا تھا کوہِ طور
خراماں ہوا سرو نوخاستہ
کیے خوانِ گوہر کے اُس پر نثار
ہوا جبکہ ڈنکا پڑی سب میں دھوم
ہزاروں ہی تھیں ہاتھیوں کی قطار
شب و روز کی سی طرحداریاں
سواروں کے غٹ اور پیادوں کی شان
جھلا بور نی جگمگی ٹانکی
اور اُن کے دبے پانوں کی پھرتیاں
چمکا چوندھ میں جس سے آوے نظر
جھلک جس کی ہر ہر قدم پر پڑے
وہ نوبت کا دولہا کا جیسے سماں
سہانی وہ نوبت کی آوے صدا
قدم با قدم بالباس زری
چلے آگے آگے ملے شاد کام
جلو میں تمامی امیر و وزیر
شہ و شاہزادے کو گردانیاں

ہوئے حکم سے شاہ کے پھر سوار
چلے سب قرینے سے باندھے قطار

سجے اور سجائے سبھی خاص و عام
لباس زری میں ملبّس تمام

طرق کے طرق اور پرے کے پرے
کچھ ادھر اُدھر کچھ ورے کچھ پرے

مرصع کیے سازوں سے کوتل سمند
کہ خوبی میں روح القدس سے دوچند

وہ فیلوں کی اور میگڈنبر کی شان
جھلکتے وہ مقیش کے سائباں

چلے پایۂ تخت کے ہو قریب
بدستور شاہانہ پتے جریب

سواری کے آگے پڑے اہتمام
لیے سونے روپے کے عاصے تمام

نقیب اور جلودار اور چوبدار
یہ آپس میں کہتے تھے ہر دم پکار

اُسی اپنے معمول و دستور سے
ادب سے تفاوت سے اور دور سے

بڑا نوجوانو۔ بڑھے جائیو
دو جانب سے باگیں لیے آئیو

بڑھے جائیں آگے سے چلتے قدم
بڑھے عمر و دولت قدم با قدم

غرض اس طرح سے سواری چلی
کہے تو کہ باد بہاری چلی

تماشائیوں کا جدا تھا ہجوم
کہ ہر طرف تھی لاکھ عالم کی دھوم

لگا قلعے سے شہر کی حد تلک
دوکانوں پہ تھی بادلے کی جھلک

منڈھے تھے تمامی سے دیوار و در
تمامی تھا وہ شہر سونے کا گھر

کیا تھا زبس شہر آئینہ بند
ہوا چوک کا لطف واں چارچند

رعیت کی کثرت ہجوم سپاہ
گزرتی تھی رک رک کے ہر جا نگاہ

ہوئے جمع کوٹھوں پہ جوں مرد و زن
ہر اک سطح تھا جوں زمین چمن

یہ خالق کی شان قدرت کاملہ
تماشے کو نکلی زن حاملہ

لگا لنج سے تا ضعیف و نحیف
تماشے کو نکلے وضیع و شریف

وحوش و طیوروں تلک بے محل
پڑے آشیانوں سے اپنے نکل

نہ پہونچا جو اک مُرغِ قبلہ نما — سو وہ آشیانے میں تڑپا کیا
زبس شاہزادہ بہت تھا حسیں — ہوئے دیکھ عاشق کہین و مہیں
نظر جس کو آیا وہ ماہِ تمام — کیا اُس نے جھک جھک کے اُسکو سلام
دُعا شاہ کو دی کہ بارِ الٰہ — سدا یہ سلامت رہے مہر و ماہ
یہ خوش اپنے مہ سے رہے شہریار — کہ روشن رہے شہر پروردگار
غرض شہر سے باہر اک سمت کو — کوئی باغ تھا شہ کا اُس میں سے ہو
گھڑی چار تک خوب سی سیر کر — رعیّت کو دکھلا کے اپنا پسر
اُسی کثرت فوج سے ہو سوار — پھرا شہر کی طرف وہ شہریار
سواری کو پہونچا گئی فوج اُدھر — گئے اپنے منزل میں شمس و قمر
جہاں تک کہ تھیں خاندانِ محل — خوشی سے وہ ڈیوڑھی تک آئیں نکل
قدم اپنے حجروں سے باہر نکال — کیا سب نے آپیشوا حال حال
بلائیں لگیں لینے سب ایک بار — کیا جی کو یکدست سب نے نثار
گیا جب محل میں وہ سروِ رواں — بندھا ناچ اور راگ کا واں سماں
پہر رات تک پہنے پوشاک وہ — رہا ساتھ سب کے طربناک وہ

سوالات

(۱) مثنوی کو دیگر اصنافِ سخن پر کیا فضیلت ہے؟

(۲) "میر حسن کی بدرِ منیر سے بہتر مثنوی اُردو ادب میں کسی نے نہیں لکھی"۔ اس پر بحث کیجیے۔

(۳) میر حسن کی مثنوی کی خصوصیات کیا ہیں؟

(۴) مثنوی نے اُردو میں ڈراما کی کمی کو پورا کیا۔ آپ کو اس سے اتفاق ہے یا

نہیں ؟ وجہ بتائیے۔

(۵) جس حد تک ڈراما کی کمی کو بدر منیر نے پورا کیا ہے۔ کسی اور مثنوی نے بھی پورا کیا ؟

پنڈت دیاشنکر نسیم

آپ کا نام پنڈت دیاشنکر۔ تخلص نسیم تھا۔ کشمیری الاصل فرقۂ کول سے تھے۔ آپ کے والد پنڈت گنگا پرشاد کول نہایت معزز خاندان سے تھے۔ پنڈت جی آتش مرحوم کے شاگرد تھے اور انھیں کو اپنا ہر قسم کا کلام دکھاتے تھے۔ آپ ۱۲۳۷ھ میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ اور یہیں قیام پذیر رہے۔ یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ اور زبان فارسی میں کافی دستگاہ بہم پہونچائی سخن گوئی کا شوق ہوا تو قدیم اُردو فارسی کا کلام پڑھا۔ اور اپنے ذوق کو پختہ کر کے بہ عمر ۲۰ سال آتش کے شاگرد ہوئے۔

لکھنؤ قدیم سے ادبی دلچسپیوں کا مرکز رہا ہے۔ نسیم بھی برابر مشاعروں وغیرہ میں شریک ہوتے رہے اور داد سخن دیتے رہے شروع میں مدت تک غزل گوئی ہی تک شاعری محدود رہی اسی وجہ سے ایک اچھا خاصہ دیوان فراہم ہو گیا جس کو دیکھ کر اُن کے رنگ سخن کا جو اندازہ ہوتا ہے وہ یہ ہے۔ کہ وہ صاف صاف شعر کہتے تھے۔ نہ اُس میں مبالغہ کی بھرمار تھی اور نہ لکھنؤ کے رنگ قدیم کی طرح ایہام۔ اور مراعات النظیر کے دلدادہ تھے سیدھی بات

کو سیدھی طرح کہنا جانتے تھے۔ اگرچہ اُن کے کلام میں اُن کے اُستاد
کی سی درویشانہ طرز نہ تھی۔ درد و اثر بہت کم تھا۔ پھر بھی اُن کی
غزلیں اچھی خاصی ہوتی تھیں۔ مگر یہ اس درجہ کی نہ تھیں کہ اُن کی
شہرت عالمگیر ہو جائے۔

۱۲۵۴ھ میں اُنھوں نے مثنوی گلزارِ نسیم لکھی جس میں ایک
ایسے قصّے کو نظم کیا جو نثر میں پہلے سے موجود تھا جس کے لیے
وہ کہتے ہیں ؎

وہ نثر ہے داد نظم دوں میں　　اس مے کو دو آتشہ کروں میں

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کتنے عرصے میں اُنھوں نے اس کی تکمیل کی
البتہ جب ۱۲۶۰ھ میں یہ مثنوی چھپی تو اُس کی شہرت کے
ساتھ نسیم بھی مشہور ہو گئے۔ اور ہر محفل و مجلس میں اس کتاب کا ذکر
ہونے لگا۔ اور وہی شہرت سنگِ بنیادِ نیک نامی بن گئی جو آج
تک اپنی جگہ پر قائم ہے۔ سُنا جاتا ہے کہ نسیم نے یہ مثنوی بہت طویل
اور ضخیم لکھی تھی۔ اور قدیم طریق فسانہ گوئی کے طور پر اس میں بھی
داستانیں بڑے بڑے طوماروں کی طرح تھیں جب اسے تمام کر کے
اپنے اُستاد آتش کے پاس لے گئے۔ تو اُنھوں نے صلاح
دی کہ اسے مختصر کرو۔ سعادت مند شاگرد نے حکم کی تعمیل کی
مختصر کر دیا۔ اور ایسا مختصر کر دیا۔ کہ یہ اختصار اور ایجاز اُس کی
جان بن گیا۔ اور آج گلزارِ نسیم کی بڑی صفت یہی مانی جاتی ہے
کہ وہ مختصر ہے۔ اس ایجاز کے علاوہ اُس کی روانی برجستگی
بلاغت۔ رنگینی بیان۔ دلنشیں تشبیہیں بھی ایسی ہیں جو اس

میں چار چاند لگا رہی ہیں اور یہ مجموعی حیثیت سے اپنی آپ ہی نظیر ہے۔

اس مثنوی میں یوں تو مثنوی کی بھی خوبیاں ہیں۔ کمی ہے تو یہ ہے کہ زمانے کے رنگ کے موافق اس میں مراعات النظیر اور تناسب الفاظ کا بہت خیال رکھا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے دلنشینی تاثیر۔ اور ادائے مطلب میں کہیں کہیں ایک بیّن کمی محسوس ہوتی ہے۔ مگر یہ حالت سب جگہ نہیں ہے۔ اکثر جگہ نسیم ان سخت قیود کے باوجود بھی اپنی سحر بیانی میں کامیاب ہوئے ہیں۔ دوسری کمی یہ ہے کہ اس میں بعض ایسے سوقیانہ اشعار بھی حذف ہونے سے رہ گئے ہیں جو نہ ہونا چاہیے تھے جنھیں اب بعض لوگوں نے مثنوی سے خارج کر دیا ہے۔

بعض لوگ اس کا میر حسن کی سحر البیان سے مقابلہ کرتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں سحر البیان کی بنا جذبات آمد۔ زبان۔ سادگی۔ محاکات پر ہے۔ اور گلزار نسیم کی بلاغت۔ تشبیہ و استعارات کی رنگینی۔ ایجاز و اختصار پر ہے۔ اور یہ فرق ایسا فرق ہے۔ جو کسی صورت سے تقابل کی اجازت نہیں دیتا۔ گلزار نسیم کے بہت سے شعر ایسے زبانوں پر چڑھ گئے ہیں کہ اُن کو ضرب الامثال کا درجہ حاصل ہے۔ اسی سے وہ مصنّف کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے قابل ہے۔

افسوس کہ سنہ ۱۲۶۰ھ عینِ عالمِ شباب میں نسیم نے لکھنؤ ہی میں انتقال کیا۔ اسی سال مثنوی بھی چھپی تھی۔ ذیل میں گلزار نسیم کا

وہ حصہ درج ہے جہاں مصنّف نے زورِ قلم دکھانے میں اپنی پوری قوت صرف کردی ہے۔

آوارہ ہونا بکاؤلی کا تاج الملوک و گلچین کی تلاش میں

گل کا جو الم چمن چمن ہے — یوں بُلبُلِ خامہ نعرہ زن ہے

گلچیں نے وہ پھول جب اُڑایا — اور غنچۂ صبح کھلکھلایا

وہ سبزۂ باغ خواب آرام — یعنی وہ بکاؤلی گُل اندام

جاگی مُرغِ سحر کے غُل سے — اُٹھی نکہت سی فرشِ گل سے

مُنھ دُھونے جو آنکھ ملتی آئی — پُر آب وہ چشمِ حوض پائی

دیکھا تو وہ گُل[1] ہَوَا ہُوا ہے — کچھ اور ہی[2] گُل کھلا ہوا ہے

گھبرائی! ہیں کدھر گیا گُل — جھنجلائی کہ کون دے گیا جُل

ہے ہے مرا پھول لے گیا کون — ہے ہے مجھے خار[3] دے گیا کون

ہاتھ اُس پہ اگر پڑا نہیں ہے — بُو ہو کے تو پھول اُڑا نہیں ہے

نرگس[4] تو دکھا کدھر گیا گُل — سوسن تو بتا کدھر گیا گُل

سُنبل مرا تازیانہ لانا — شمشاد اُنھیں سُولی پر چڑھانا

تھرائیں خواصیں صورتِ بید — ایک ایک سے پوچھنے لگی بھید

---

[1] ہَوَا ہونا۔ غائب ہونا [2] کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے۔ کچھ اور ہی معاملہ درپیش ہو [3] خار دینا غم میں مبتلا کرنا [4] نرگس کو آنکھوں سے استعارہ کرتے ہیں۔ اُسکی رعایت سے "دکھا" کہا ہے! اور سوسن کی تشبیہ زبان سے دیجاتی ہے اسکے لیے "بتا" کا لفظ کہا ہے۔ اسیطرح سنبل کیلیے تازیانہ اور شمشاد کیلیے سُولی کہا ہے سنبل تازیانہ سے اور شمشاد سُولی سے مشابہ ہے نرگس سوسن سنبل اور شمشاد صرف پھولوں اور درختوں ہی کے نام نہیں ہیں بلکہ نام خواصوں کے بھی رکھے جاتے ہیں۔

نرگس نے نگاہ بازیاں کیں
سوسن نے زباں درازیاں کیں

پتّا بھی پتے کو جب نہ پایا
کہنے لگی کیا ہوا خدایا

اپنوں میں سے پھول لے گیا کون
بیگانہ[1] تھا سبزے کے سوا کون

شبنم کے سوا چُرانے والا
اوپر کا[2] تھا کون آنے والا

جس کف میں وہ گُل ہو داغ ہو جائے
جس گھر میں ہو گُل چراغ[3] ہو جائے

بولی وہ بکاولی کہ افسوس
غفلت سے یہ پھول پر پڑی اوس[4]

آنکھوں سے عزیز گُل مرا تھا
پتلی وہی چشم حوض کا تھا

نام اُس کا صبا نہ لیتی تھی میں
اُس گُل کو ہوا نہ دیتی تھی میں

گلچیں[5] کا جو ہائے ہاتھ ٹوٹا
غنچے کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا[6]

او خار پڑا نہ تیرا اُچنگل
مُشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل

او بادِ صبا ہوا نہ تیرا
خوشبو ہی سونگھا پتا نہ تیرا

بلبل تو چہک اگر خبر ہے
گُل تو ہی مہک بتا کدھر ہے

لرزاں تھی زمیں یہ دیکھ کہرام
تھی سبزہ سے راست مو براندام

انگلی لب جو پہ رکھ کے شمشاد
تھا دم بخود اُس کی سُن کے فریاد

جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا
جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا

رنگ اُس کا لگا غرض بدلنے
گلبرگ سے کف لگی وہ ملنے

بدلے کی انگوٹھی ڈھیلی پائی
دست آویز اُس کے ہاتھ آئی

---

۱ اصطلاحِ شعرا میں سبزہ کو بیگانہ کہتے ہیں ۲ اوپر کا آنے والا محاورہ ہے بمعنے باہر کا کوئی اجنبی آنے والا ۳ چراغ گل ہو جانا بمعنے ستیاناس ہو جانا ۴ اوس پڑنا۔ برباد ہو جانا ۵ گلچیں کا جو ہائے ہاتھ ٹوٹا۔ عورتوں کے کوسنے کا طریقہ ہے یعنی جس ہاتھ سے اُس نے پھول توڑا وہ ٹوٹ کیوں نہ گیا ۶ منہ سے کچھ نہ پھوٹنا محاورہ ہے یعنی کوئی آواز نہ نکلی۔

خاتم[1] بھی نام کی نشانی — انسان کی دستبرد جانی
ہاتھوں کو مَلا کہا کہ ہیہات — خاتم بھی بدل گیا ہے بدذات
جس نے مجھے ہاتھ سے لگایا — وہ ہاتھ لگے کہیں خدایا
عُریاں مجھے دیکھ کر گیا ہے — کھال اُس کی جو کھنچے سزا ہے
یہ کہہ کے جنوں میں ہو غضبناک — خوں روئی لباس کو کیا چاک
گُل کا سا لہو بھرا گریباں — سبزے کا سا تار تار داماں
دکھلا کے کہا سمن پری کو — اب چین کہاں بکاولی کو
تھی بسکہ غُبار سے بھری وہ — آندھی سی اُٹھی ہوا ہوئی وہ
کہتی تھی پری کہ اُڑ کے جاتی — گلچیں کا کہیں پتا لگاتی
ہر باغ میں پھولتی پھری وہ — ہر شاخ پہ جھولتی پھری وہ
جس تختہ میں مثل باد جاتی — اُس رنگ[2] کے گُل کی بو نہ پاتی
بے وقت کسی کو کچھ ملا ہے — پتّا کہیں حُکم بن ہلا ہے

پہونچنا تاج الملوک کا ایک اندھے فقیر کے تکئے پر اور آزمانا گُل کا

پھرنا جو وطن کا مدّعا ہے — اب صفحہ پہ یوں قلم پھرا ہے
وہ گلشنِ مدّعا کا گلچیں — یعنے تاج الملوک حق بیں
جس وقت گُل اُس چمن سے لایا — محمود وہ خوش ہوئی کہ آیا
کہنے لگی لو مُراد پائی — بولا وہ جو یاں سے ہو رہائی
جب دیو سیاہ شب سے مہتاب — رخصت ہوا جیسے چشم سے خواب
اور گُل لیے آفتاب تاباں — ہنگام سحر ہوا شتاباں

۱؎ خاتم انگوٹھی ۱۲ ۲؎ اس رنگ کے گل کی بُو نہ پاتی یعنی اس رنگ کا پھول دکھائی نہ دیتا تھا ۱۲

وہ مہر وش اور وہ ماہ پیکر　　اُس دیونی پاس آئے مضطر
گُل کی وہ غرض جتائی اُس کو　　رخصت کی طلب سُنائی اُس کو
کیا کہتی وہ دیونی کہا جاؤ　　دیوؤں سے کہا کہ تخت لے آؤ
دو بال دیے کہ لو مری لاگ　　جب وقت پڑے دکھائیو آگ
دیو اُن کو سریر[۱] پر بٹھا کے　　پرواز کناں ہُوا پہ جا کے
بولے کہ کدھر چلو گے کہہ دو　　فردوس کے رُخ کہا ادھر کو
وہ مُڑ کے اُدھر کو اُڑ کے آئے　　گلزار میں بسیوا کے لائے
وقت سحر اور خنک ہوا تھی　　گلگشت چمن میں بسیوا تھی
چار آنکھیں ہوئیں تو تھی شناسا　　قدموں پہ گری وہ سایہ آسا
صدقے ہو کر کہا خوش آئے　　جس گُل کی ہوا لگی تھی لائے
ہمراہ یہ کون دوسری ہے　　سایہ ہے کہ ہم قدم پری ہے
بولا شہزادہ شکر ہے ہاں　　پُر ہے گل آرزو سے داماں
محمود وہ نام ہے جو یہ ساتھ　　پھول ان کے سبب سے آ گیا ہاتھ
جیتا جو پھرا وہ رشک شمشاد　　قیدی کئے بسیوا نے آزاد
شہزادہ نے بھائیوں کے لے نام[۲]　　بھجوایا برائے داغ پیغام
چھوٹوں اس نے تھا ان کو تایا　　سچوں کھوٹوں نے داغ کھایا
داغا تو چلے تفنگ[۳] سے زہ　　چھوٹے قیدِ[۴] فرنگ سے وہ

---

۱ سریر بمعنے تخت ۲ تاج الملوک نے بھائیوں کو آزاد کرانے کے لئے داغ لگانے کا حکم دیا تھا (داغ لگایا جانا قیدی ہونے کی علامت ہے) لیکن وہاں سچ مچ اُن کے داغ لگا دیے گئے۔ جھوٹوں سچوں میں تضاد۔ "دہ" "تایا" "کھوٹوں" اور "داغ" میں مناسبت لفظی ہے ۳ داغا کی رعایت سے تفنگ، بندوق، لکھا ہے ۴ اہل فرنگ کی ایک سخت قید جس سے رہائی دشوار ہوتی تھی۔

چھوڑا ہوس گُل و چمن کو — چاروں داغی پھرے وطن کو
بندوں کو کیا جب اس نے آزاد — آیا لب جو وہ رشکِ شمشاد
اسباب کو کشتیوں پہ کر بار — سونپا سب ناخدا کو گھر بار
جب متصل آگیا وطن کے — خندے یاد آئے مرد و زن کے
سوچا کہ میں خود ہوں خانہ برباد — کیا جانیے کیا پڑے گی اُفتاد
لازم ہے گُل اپنے ہاتھ رکھیے — موقع نہیں بھیڑ ساتھ رکھیے
لنگر کا اُنھیں کیا اشارہ — خود کشتی سے کر گیا کنارہ
وہ پوربی[1] کر کے جوگیا بھیس — جنگلے کی راہ سے چلا دیس
تکیے پہ فقیر پیر اندھا — اک گوشہ میں آنکھیں مانگتا تھا
تھا نقش قدم سا خاک رہ پر — ٹھہرا وہ مسافر اس جگہ پر
بے تجربہ تھی نمائشِ گُل — واجب تھی آزمائشِ گُل
پتلی پہ زرِ گُل آزمایا — سونے کو کسوٹی پر چڑھایا
گُل سے ہوئیں چشم کور تاباں — ہو جیسے چراغ سے چراغاں
مُنھ دیکھ کے اُس نے دی دعائیں — پنجے سے مژہ کی لیں بلائیں
گُل کے جو اثر سے شادماں تھا — گلچیں وہ ہوا سے ہمعناں تھا

---

[1] پوربی۔ جوگیا۔ جنگلا اور دیس راگنیوں کے نام ہیں۔ جوگی چونکہ بھجن وغیرہ گایا کرتے ہیں۔ اور عام طور سے جوگیوں کو موسیقی کا شوق ہوتا ہے۔ غالباً "اس خیال" یا ممکن ہے صرف "جوگیا بھیس" پر لکھنؤ کے مذاق کے موافق اس طرح کا ضلع استعمال کر گئے۔

ملنا چاروں شہزادوں کا اور چھن جانا گُلِ بکاؤلی کا تاج الملوک سے اور بینا ہونا حشم زین الملوک کا

ہے بسکہ یہ چرخ جور پیشہ / یوں خار رہِ قلم ہے ریشہ

یہ ٹھیرے اسی جگہ پہ ناگاہ / آپہونچے وہ چاروں غول ہمراہ

کہتے تھے کہ واہ رے مقدر / کس شکل سے پھر کے جاتے ہیں گھر

کیا رنگ زمانہ نے دکھائے / گُل لینے گئے تھے داغ لائے

کس مُنھ سے پدر کے آگے جائیں / کیونکر بے پھول مُنھ دکھائیں

ٹھرائی کہ اور پھول لے جائیں / کحال کو بے وقوف ٹھرائیں

اک بادہوائی توڑ کر پھول / کہنے لگے پھول پھول کر غول

کیا پھول ہے کیا اثر ہے اس میں / ہوجاتی ہیں روشن اندھی آنکھیں

وہ کور کہ ہو چکا تھا بینا / دیکھا اُس نے جو یہ قرینا

بولا کہ یہ گُل وہ گُل نہیں ہے / اُس پھول کی اور گُل زمیں[۱] ہے

وہ جوگی جو جاتے ہیں اگر آئیں / دکھلائیں وہ گُل تو آنکھیں کھُل جائیں

میں کور ابھی ہو چکا ہوں بینا / اندھا نہیں اب ہوا ہوں بینا

چاروں کو تھی حسرت گُلِ تر / چو بائی ہوا کی طرح چل کر

اُس جوگی کے جب برابر آئے / باہم کہا دیکھو پھول لائے

گُل ہے کہ علاجِ نور ہے یہ / گُل ہے کہ چراغِ طور ہے یہ

جوگی یعنی وہ شاہزادہ / بولا کہ کچھ نہیں زیادہ

۱؎ گُل زمیں کاشت کی جگہ مطلب یہ ہے کہ اُس پھول کی بات ہی اور ہے۔

پاتے اگر اس درخت کی چھاؤں ... دیکھتے ہی نہ تم زمیں پہ پاؤں
ڈینگ آپ کی سب فضول ہے یہ ... وہ گل یہ نہیں وہ پھول ہے یہ
یہ کہہ کے جو جیب سے نکالا ... ان مفت بروں نے ہاتھ ڈالا
قوت میں وہ چار تھے یہ بیکس ... شورش میں وہ چار موج یہ خس
غولوں[1] نے بزور پھول اڑایا ... اُس خضر کو راستا بتایا
گُل پانے سے بسکہ سرخرو تھے ... گھوڑوں پہ ہوائے مشک بو تھے
تعجیل سے روبراہ آئے ... گُل لے کے حضور شاہ آئے
گل لائے جو نور دیدہ نخواہ ... آنکھوں کی طرح پھڑک[2] گیا شاہ
نیچے سے پلک کے پھول اُٹھایا ... اندھے نے گل آنکھوں سے لگایا
نور آگیا چشم آرزو میں ... آیا پھر آب رفتہ جو میں
خورشید بصر گہن سے چھوٹا ... خیرات کے زر کا قفل ٹوٹا
دولت جو پاس تھی لٹائی ... زر بخشا گُل کی رُونمائی
ایک ایک کو اس قدر دیا زر ... محتاج گدا ہوئے تونگر
سجوائے طرب کے کارخانے ... بجوائے خوشی کے شادیانے

پہونچنا بکاولی کا دار الخلافت زین الملوک میں اور وزیر ہو کر تاج الملوک کی تلاش میں رہنا

گلچیں کا جواب پتا ملا ہے ... یوں شاخ قلم سے گُل کھلا ہے

---

[1] غول یعنے ہمراہ ہونیوالے خضر کیلئے مشہور ہے کہ وہ بھولے ہوؤں کو راستہ بتاتے ہیں یہاں راستہ بتانیکا مطلب چلتا کر دینے اور دھتکار دینے کے ہیں۔ غول، خضر اور راستہ بتانا۔ ان سب میں باہم رعایت لفظی ہے۔ [2] پھڑک جانا کوئی نہایت عجیب چیز دیکھ کر خوش ہو جانے کو کہتے ہیں۔

وہ بادِ چمن چمن خراماں — یعنی وہ بکاؤلی پریشاں

گلشن سے جو خاک[1] اُڑاتی آئی — اُس شہر میں آتے آتے آئی

دیکھا تو خوشی کے چہچہے تھے — گلچیں کے شگوفہ کھل رہے تھے

گلبانگ زناں تھا جو جہاں تھا — ایک ایک ہزار داستاں تھا

پاتے ہی پتا خوشی سے پھولی — شاد ایسی ہوئی کہ رنج بھولی

جادو سے بنی وہ آدمی زاد — انسانوں میں آ ملی پری زاد

سلطاں کی سواری آ رہی تھی — صورت جو نگاہ کی پری تھی

پوچھا اے آدم پریرو — انساں ہے پری ہے کون ہے تو

کیا نام ہے اور وطن کدھر ہے — ہے کونسا گل چمن کدھر ہے

دی اُس نے دُعا کہا بصد سوز — فرخ ہوں شہا میں ابن فیروز

گل ہوں تو کوئی چمن بتاؤں — غربت زدہ کیا وطن بتاؤں

گھربار سے کیا فقیر کو کام — کیا کیجیے چھوڑے[2] گاؤں کا نام

پوچھا[3] کہ سبب کہا کہ قسمت — پوچھا کہ طلب کہا قناعت

باتوں پہ فدا ہوا شہنشاہ — لایا بصد امتیاز ہمراہ

چہرے سے امیرزادہ پایا — گھر لا کے وزیر اُسے بنایا

نذریں لیے بندگانِ درگاہ — دستور[4] سے آ ملے بصد جاہ

دربار میں چاروں شاہزادے — دیکھے تو کھلے وہ دل کے سادے

چاہا گلچیں کا امتحاں لے — پوچھا کہ نگیں جو لے کہاں لے

---

[1] خاک اُڑانا بسرگرداں و پریشاں ہونا [2] محاورے کا مطلب یہ ہے کہ جس جگہ کو چھوڑ دیا وہاں سے اپنا کوئی تعلق ظاہر کرنا بیکار ہے [3] بادشاہ نے پوچھا کہ گھر سے اسقدر بے تعلقی کا سبب کیا ہے تو فرخ نے جواب دیا کہ قسمت میں یہی لکھا تھا [4] بمعنے وزیر اعظم اور رسم ورواج۔

تبلانے لگے وہ چاروں ناداں — کوئی یمن اور کوئی بدخشاں
جانا کہ جو گل یہ لائے ہوتے — خاتم کے نگیں بنائے ہوتے
تجویز میں تھا یہ صاحبِ فکر — آیا تاج الملوک کا ذکر
ظاہر نہ کیا بطوں اپنا — طالع سے لیا شگون اپنا
منزل گہِ رہرواں بنا کے — شام و سحر اُس میں آپ آ کے
رہرو کو دیا بہ لطف و اکرام — آتے آرام جاتے پیغام

آباد ہونا تاج الملوک کا گلشن نگارین بنوا کے اور شہرہ ہونا

تعمیر مکاں کے ہیں جو آثار — یوں خامہ ہے بہرِ بیت معمار
شہزادہ کہ عازمِ وطن تھا — گل پانے سے خوش چمن چمن تھا
اندھے کو کیا جب اُس نے بینا — اور داغیوں نے وہ پھول چھینا
سوچا کہ خوشی خدا کی غم کھاؤ — حمّالہ دیونی کو بلواؤ
نقلِ ارم اک مکان بنا کے — رکھو پریوں کو اپنی لا کے
بال آگ پہ رکھتے آندھی آئی — وہ دیونی بال[1] باندھی آئی
تنہا اُسے دیکھ کر کہاں ہیں — محمود وہ کیا ہوئیں کہاں ہیں
دریا پہ ہوں اُن کو چھوڑ آیا — مسکن کے لیے تمھیں بلایا
لیکن وہ مکان وہ حوض وہ باغ — جو باغ بکاولی کو دے داغ
حمّالہ نے دیوؤں کو کیا یاد — آئے تو کہا یہ بن ہو آباد
ویرانے کو گل زمیں بناؤ — گلزارِ جواہریں بناؤ
صنّاعِ طلسم کار تھے وہ — گلشن کے لیے بہار تھے وہ

---

[1] بال باندھی آئی۔ تابع فرماں حاضر ہوئی۔

دیوؤں نے ادھر محل بنایا — کشتی سے وہ دخترِ رز کو لایا
حمالہ اُس کی مادرِ پیر — محمودہ سے ہوئی بغلگیر
کچھ دیوؤں کو چھوڑ کر وہیں پر — رخصت ہو کر چلی گئی گھر
گلشن میں سمن بروں کو بلایا — نسریں بدنوں سے گھر بسایا
دیوؤں کو کہا کہ بہرِ تمکیں — آباد ہو گلشنِ نگاریں
دیو آدمی بن کے بن میں آئے — آتے جاتے کو گھیر لائے
جو سُن کے خبر گیا اُدھر کو — جنت سے وہ پھر پھرا نہ گھر کو
از بسکہ قریب شہر تھا باغ — خورشید اُفق نظر پڑا باغ
مفلس زردار امیر قلاش — نوکر تاجر فقیر خوش باش
گھر چھوڑ کے چل بسے سب انساں — پھر تن میں نہ آئے صورتِ جاں

ملاقات ٹھہرنی زین الملوک اور تاج الملوک کی آپس میں

گلشن جو بنا جواہر آگیں — یوں صفحہ قلم سے ہے نگاریں
ساعد نام ایک مہ لقا تھا — دلبر کا غلام باوفا تھا
صحرا سے جو سیر کر کے آیا — لکڑی کے چکا کے بوجھ لایا
دلوائے ہر ایک کو پئے قوت[1] — الماس و عقیق و لعل و یاقوت
تھی بسکہ وہ جا خلاصۂ دہر — کچھ ٹھہرے کچھ آئے جانبِ شہر
کف میں جو وہ لعلِ بے بہا تھے — من[2] پاتے ہی لوگ اژدہا تھے
شحنہ[3] نے سنا پکڑ بلایا — لے کر اظہار ساتھ آیا

---

۱ قوت۔ روزی ۲ لعل کو من سے اور دشمن کو اژدہے سے تشبیہ دی ہے

۳ شحنہ یعنے کوتوال شہر۔

دیکھا تو وہ جلوہ گاہِ اُمید — اک دائرہ تھا برنگِ خورشید

دروازہ پہ دیوؤں کا تھا پہرا — بھجوا کے خبر وہ شحنہ ٹھہرا

جب واں سے طلب ہوا تو درباں — لائے اُسے پیشگاہِ سُلطاں

آداب کیا ادب سے ٹھہرا — ہیبت زدہ دور سب سے ٹھہرا

اُن لوگوں کو لے گیا تھا ہمراہ — معروض کیا کہ یا شہنشاہ

کم مایہ یہ لوگ ہیں بظاہر — چوری کے تو یہ نہیں جواہر

ساعد نے کہا کہ ہے یہ حاسد — نیّت ہوئی ہوگی اس کی فاسد

حضرت یہ وہی تو ہیں تبردار — جا ان سے نہ بولیو خبردار

پھر کر انھیں پاؤں[1] شحنہ بے آس — آیا زین الملوک کے پاس

کی عرض کہ باغ اک بنا ہے — یہ شہر اُجڑا ہے وہ بسا ہے

جو کوئی ہے اُس جگہ پہ جاتا — ڈھیروں ہے جواہرات پاتا

حضرت نے کہا کہ بک نہ خیرہ — قارُوں[2] کا وہیں ہے کیا ذخیرہ

فرخ کہ وزیر باخرد تھا — سلطاں کا مشیر نیک و بد تھا

بولا کہ شہا یہ بات کیا ہے — نیرنگ و فسوں کا گھر بڑا ہے

ہرچند کہ طرفہ حال ہے یہ — کچھ دور نہیں مثال ہے یہ

---

[1] انھیں پاؤں پھر کر آنا یعنی فوراً واپس آنا [2] حضرت موسےٰ علیہ السّلام کے وقت میں ایک نہایت مالدار شخص تھا۔ جو حضرت موسےٰ کی بد دعا سے زمین میں دھنس گیا۔ یہاں اُسکی دولتمندی کی طرف اشارہ ہے۔

منظومات جدید

حالی پانی پتی

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی ۱۸۳۷ء میں
پیدا ہوئے۔ غریب باپ کا سایہ نو برس کی عمر میں سر سے اُٹھ گیا
۱۸۵۴ء میں تحصیل علم کے شوق میں دہلی چلے آئے۔ اور مولوی
نوازش علی سے تعلیم حاصل کرنا شروع کردی غدر کے زمانہ میں
پانی پت رہ کر حدیث، تفسیر، منطق و فلسفہ پڑھا کچھ عرصہ کے بعد
نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کی مصاحبت کا شرف حاصل ہو گیا
نواب صاحب کی صحبت نے شعر و شاعری کے ذوق کو اُبھارا اور اپنی
غزلیں مرزا غالب کے پاس اصلاح کے لیے بھیجنے لگے۔ آٹھ برس کے
بعد حالی لاہور کے گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازم ہو گئے۔ یہاں
ان کی جدید شاعری کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور انگریزی خیالات
اور طرز ادا سے خاص مناسبت پیدا کر لی۔ کچھ عرصہ کے بعد حالی
دہلی میں عربک اسکول میں مدرس ہو گئے۔ یہاں سرسیدؒ سے
ملاقات ہو گئی یہ ملاقات بڑی اہمیت رکھتی ہے اس لئے اسکے بعد
حالی نے قومی اور اخلاقی نظمیں لکھنا شروع کیں مدوجزر اسلام

اسی زمانہ کی یادگار ہے۔ حالی کی منظوم تصانیف یہ ہیں (۱) مثنویاں رحم و انصاف وغیرہ (۲) مدوجزر اسلام (۳) شکوۂ ہند۔ (۴) کلیات حالی۔ (۵) مناجات بیوہ۔ (۶) مراثی غالب وغیرہ (۷) مجموعہ نظم حالی۔

حالی نے زبان و بیان کے بھی بڑے کارنامے دکھلائے ہیں ایک جگہ دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ اسطرح کھینچا ہے۔

ریت کی سی دیوار ہے دنیا
اوچھے کا سا پیار ہے دنیا
بجلی کی سی چمک ہے اس کی
پل دو پل جھمک ہے اس کی
پانی کا سا را ہے یہ پچارا
جگنو کا سا ہے چمکارا
ساتھ سہاگ اور سوگ ہے یہاں کا
ناؤ کا سنجوگ ہے یہاں کا
ہار کبھی اور جیت کبھی ہے
اس نگری کی ریت یہی ہے

حالی نے جدید اُردو شاعری کا سنگ بنیاد ہی نہیں رکھا بلکہ مستقبل کے شعراء پر بھی اثر ڈالا ہے حالی کے ساتھ ساتھ آزاد نے بھی اپنی نظموں میں جدت طرازی کے نمونے دکھلائے ہیں۔

گرمی کا موسم

گرمی سے تڑپ رہے تھے جاندار
اور دھوپ میں تپ رہے تھے کہسار
بھوبل سے سوا تھا ریگ صحرا
اور کھول رہا تھا آب دریا
تھی لوٹ سی پڑ رہی چمن میں
اور آگ سی لگ رہی تھی بن میں
سانڈے تھے بلوں میں منھ چھپائے
اور ہانپ رہے تھے چارپائے
تھیں لومڑیاں زباں نکالے
اور لُو سے ہرن ہوے تھے کالے
چیتوں کو نہ تھی شکار کی سدھ
ہرنوں کو نہ تھی قطار کی سدھ

تھے شیر پڑے کچھار میں مست ۔۔۔ گھڑیال تھے رود بار میں مست
ڈھوروں کا ہوا تھا حال پتلا ۔۔۔ بیلوں نے دیا تھا ڈال کندھا
بھینسوں کے لہو نہ تھا بدن میں ۔۔۔ اور دودھ نہ تھا گئو کے تھن میں
گھوڑوں کا چھٹا تھا گھاس دانہ ۔۔۔ تھا پیاس کا اُن پہ تازیانہ
طوفاں تھے آندھیوں کے برپا ۔۔۔ اُٹھتا تھا بگولے پر بگولا
آرے تھے بدن پہ لُو کے چلتے ۔۔۔ شُعلے تھے زمیں سے نکلتے
تھی سب کی نگاہ سوئے افلاک ۔۔۔ پانی کی جگہ برستی تھی خاک
پنکھے سے نکلتی جو ہوا تھی ۔۔۔ وہ بادِ سموم سے سوا تھی
سات آٹھ بجے سے دن چھپے تک ۔۔۔ جانداروں پہ دھوپ کی تھی دستک
ٹٹّی میں تھا دن گنواتا کوئی ۔۔۔ تہ خانوں میں منھ چھپاتا کوئی
بازار پڑے تھے سارے سُنساں ۔۔۔ آتی تھی نظر نہ شکلِ انساں
چلتی تھی دکان جنکی دن رات ۔۔۔ بیٹھے تھے وہ ہاتھ پر دیے ہاتھ
خلقت کا ہجوم کچھ اگر تھا ۔۔۔ پیاؤ پہ یا سبیل پر تھا
پانی پہ تھی سب کی زندگانی ۔۔۔ میلا تھا وہاں جہاں تھا پانی
تھیں برف پہ نیتیں ٹپکتی ۔۔۔ فالودے پہ رال تھی ٹپکتی
تھے جو خفقانی و مراقی ۔۔۔ گرمی سے نہ تھا کچھ ان میں باقی
کھانے کا نہ تھا اُنھیں مزا کچھ ۔۔۔ آٹھ آٹھ پہر نہ تھی غذا کچھ
بن کھائے کئی کئی دن اکثر ۔۔۔ رہتے تھے فقط ٹھنڈائیوں پر
شب کٹتی تھی ایڑیاں رگڑتے ۔۔۔ مرپیٹ کے صبح تھے پکڑتے
بچّوں کا ہوا تھا حال بے حال ۔۔۔ کملائے ہوئے تھے پھول سے گال
آنکھوں میں تھا اُن کا پیاس سے دم ۔۔۔ تھے پانی کو دیکھ کرتے مم مم

پانی دیا گر کسی نے لاکر — پھر چھوڑتے تھے نہ منھ لگاکر
تخصیص تھی کچھ نہ میری تیری — پانی سے نہ تھی کسی کو سیری
کل شام تلک تو تھے یہی طور — پر رات سے ہے سماں ہی کچھ اور
پُروا کی دُہائی پھر رہی ہے — پچھوا سے خدائی پھر رہی ہے

برسات کا بج رہا ہے ڈنکا
اک شور ہے آسماں پہ برپا

حُبِّ وطن

اے سپہر بریں کے سیّارو — اے فضائے زمیں کے گلزارو
اے پہاڑوں کی دلفریب فضا — اے لبِ جو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
اے عنادل کے نغمۂ سحری — اے شبِ ماہتاب تاروں بھری
اے نسیمِ بہار کے جھونکو — دہر ناپائدار کے دھوکو
تم ہر اک حال میں ہو یوں تو عزیز — تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز
جب وطن میں ہمارا تھا رہنا — تم سے دل باغ باغ تھا اپنا
تم مری دل لگی کے ساماں تھے — تم مرے دردِ دل کے درماں تھے
تم سے کٹتا تھا رنجِ تنہائی — تم سے پاتا تھا دل شکیبائی
آن اک اک تمھاری بھاتی تھی — جو ادا تھی وہ دل لبھاتی تھی
کرتے تھے جب تم اپنی غمخواری — دھوئی جاتی تھیں کلفتیں ساری
جب ہوا کھانے باغ جاتے تھے — ہو کے خوش حال گھر میں آتے تھے
بیٹھ جاتے تھے جب کبھی لبِ آب — دھو کے اُٹھتے تھے دل کے داغ شتاب
کوہ و صحرا و آسمان و زمیں — سب مری دل لگی کی شکلیں تھیں
پر چھٹا جب سے اپنا ملک و دیار — جی ہوا تم سے خود بخود بیزار

نہ گلوں کی ادا خوش آتی ہے — نہ صدا بُلبلوں کی بھاتی ہے

سیر گلشن ہے جی کا اک جنجال — شب مہتاب جان کو ہے وبال

کوہ و صحرا سے تا لبِ دریا — جس طرف جائیں دل نہیں لگتا

کیا ہوئے وہ دن اور وہ راتیں — تم میں اگلی سی اب نہیں باتیں

ہم ہی غربت میں ہو گئے کچھ اور — یا تمھارے ہی کچھ بدل گئے طور

گو وہی ہم ہیں اور وہی دنیا — پر نہیں ہم کو لطف دنیا کا

اے وطن اے مرے بہشت بریں — کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں

رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا — وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا

تیری دوری ہے موردِ آلام — تیرے چھٹنے سے چھٹ گیا آرام

کاٹے کھاتا ہے باغ بن تیرے — گُل ہیں نظروں میں داغ بن تیرے

مٹ گیا نقش کامرانی کا — تجھ سے تھا لطف زندگانی کا

جو کہ رہتے ہیں تجھ سے دور سدا — اُن کو کیا ہوگا زندگانی کا مزا

ہو گیا یاں تو دو ہی دن میں یہ حال — تجھ بن ایک ایک پل ہوا اک سال

سچ بتا تو سبھی کو بھاتا ہے — یا کہ مجھ سے ہی تیرا ناتا ہے

میں ہی کرتا ہوں تجھ پہ جان نثار — یا کہ دنیا ہے تیری عاشقِ زار

کیا زمانے کو تو عزیز نہیں — اے وطن تو تو ایسی چیز نہیں

جن و انساں کی حیات ہے تو — مرغ و ماہی کی کائنات ہے تو

ہے نباتات کی نمو تجھ سے — روکھ تجھ بن ہرے نہیں ہوتے

سب کو ہوتا ہے تجھ سے نشو و نما — سب کو بھاتی ہے تیری آب و ہوا

تیری اک مُشت خاک کے بدلے — لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

جان جب تک نہ ہو بدن سے جُدا — کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جُدا

اے دل اے بندۂ وطن ہشیار
خواب غفلت سے ہو ذرا بیدار

او شراب خودی کے متوالے
گھر کی چوکھٹ کے چومنے والے

نام ہے کیا اسی کا حُبِّ وطن
جس کی تجھ کو لگی ہوئی ہے لگن

کبھی بچوں کا دھیان آتا ہے
کبھی یاروں کا غم ستاتا ہے

یاد آتا ہے اپنا شہر کبھی
لَو کبھی اہلِ شہر کی ہے لگی

نقش ہے دل پہ کوچہ و بازار
پھرتے آنکھوں میں ہیں در و دیوار

کیا وطن کی یہی محبت ہے
یہ بھی اُلفت میں کوئی اُلفت ہے

اس میں انسان سے کم نہیں ہیں درند
اس سے خالی نہیں چرند و پرند

ٹکڑے ہوتے ہیں سنگِ غربت میں
سوکھ جاتے ہیں روکھ فرقت میں

جاکے کابل میں آم کا پودا
کبھی پروان چڑھ نہیں سکتا

آکے کابل سے یاں بہی و انار
ہو نہیں سکتے بارور زنہار

مچھلی جب چھوٹتی ہے پانی سے
ہاتھ دھوتی ہے زندگانی سے

آگ سے جب ہوا سمندر دور
اُس کو جینے کا پھر نہیں مقدور

گھوڑے جب کھیت سے بچھڑتے ہیں
جان کے لالے اُن کے پڑتے ہیں

گائے یا بھینس اونٹ یا بکری
اپنے اپنے ٹھکانے خوش ہیں سبھی

کہیے حُبِّ وطن اسی کو اگر
ہم سے حیواں نہیں ہیں کچھ کمتر

ہے کوئی اپنی قوم کا ہمدرد
نوعِ انساں کا جس کو سمجھیں فرد

جس پہ اطلاق آدمی ہو صحیح
جس کو حیواں پہ دے سکیں ترجیح

قوم پر کوئی زد نہ دیکھ سکے
قوم کا حال بد نہ دیکھ سکے

قوم سے جان تک عزیز نہ ہو
قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو

سمجھے ان کی خوشی کو راحتِ جاں
واں جو نوروز ہو تو عید ہو یاں

رنج کو ان کے سمجھے مایۂ غم — واں اگر سوگ ہو تو یاں ماتم

بھول جائے سب اپنی قدر جلیل — دیکھ کر بھائیوں کو خوار و ذلیل

جب پڑے ان پہ گردشِ افلاک — اپنی آسائشوں پہ ڈال دے خاک

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو! — اُٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو

مرد ہو تو کسی کے کام آؤ — ورنہ کھاؤ پیو چلے جاؤ

جب کوئی زندگی کا لطف اُٹھاؤ — دل کو دُکھ بھائیوں کا یاد دلاؤ

پہنو جب کوئی عمدہ تم پوشاک — کرو دامن سے تا گریباں چاک

کھانا کھاؤ تو جی میں تم شرماؤ — ٹھنڈا پانی پیو تو اشک بہاؤ

کتنے بھائی تمھارے ہیں نادار — زندگی سے ہے جن کا دل بیزار

نوکروں کی تمھارے جو ہے غذا — ان کو وہ خواب میں نہیں ملتا

جس پہ تم جوتیوں سے پھرتے ہو — واں میسر نہیں وہ اوڑھنے کو

کھاؤ تو پہلے لو خبر اُن کی — جن پہ بپتا ہے نیستی کی پڑی

پہنو تو پہلے بھائیوں کو پہناؤ — کہ ہے اُترن تمھاری جن کا بناؤ

ایک ڈالی کے سب ہیں برگ و ثمر — ہے کوئی ان میں خشک اور کوئی تر

سب کو ہے ایک اصل سے پیوند — کوئی آزردہ ہے کوئی خرسند

مقبلو! مدبروں کو یاد کرو — خوش دلو! غمزدوں کو شاد کرو

جاگنے والو غافلوں کو جگاؤ — تیرنے والو ڈوبتوں کو تراؤ

ہیں سبے تم کو چشم و گوش اگر — لو جو لی جائے کور و کر کی خبر

تم اگر ہاتھ پاؤں رکھتے ہو — لنگڑے لولوں کو کچھ سہارا دو

تندرستی کا شکر کیا ہے بتاؤ — رنج بیمار بھائیوں کا بٹاؤ

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر — نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر

سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو　سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو

ملک ہیں اتفاق سے آزاد　شہر ہیں اتفاق سے آباد

ہند میں اتفاق ہوتا اگر　کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر

قوم جب اتفاق کھو بیٹھی　اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی

ایک کا ایک ہو گیا بدخواہ　لگی غیروں کی پڑنے تم پہ نگاہ

پھر گئے بھائیوں سے جب بھائی　جو نہ آنی تھی وہ بلا آئی

پاؤں اقبال کے اکھڑنے لگے　ملک پر سب کے پاؤں پڑنے لگے

قوم سے جو تمھارے ہیں برتاؤ　سوچو اے میرے پیارو اور شرماؤ

اہلِ دولت کو ہے یہ استغنا　کہ نہیں بھائیوں کی کچھ پروا

شہر میں قحط کی دہائی ہے　جانِ عالم لبوں پہ آئی ہے

بھوک میں ہے کوئی نڈھال پڑا　موت کی مانگتا ہے کوئی دعا

بچے اک گھر میں بلبلاتے ہیں　رو کے ماں باپ کو رُلاتے ہیں

کوئی پھرتا ہے مانگتا در در　ہے کہیں پیٹ پر بندھا پتھر

پر جو ہیں ان میں صاحبِ مقدور　ان میں گنتی کے ہونگے ایسے غیور

کہ جنھیں بھائیوں کا غم ہوگا　اپنی راحت کا دھیان کم ہوگا

جتنے دیکھو گے پاؤگے بے درد　دل کے نامرد اور نام کے مرد

عیش میں جنکے کٹتے ہیں اوقات　عید ہے دن تو شب برات ہے رات

قوم مرتی ہے بھوک سے تو مرے　کام اُنھیں اپنے حلوے مانڈے سے

ان کو اب تک خبر نہیں اصلا　شہر میں بھاؤ کیا ہے غلّہ کا

غلّہ ارزاں ہے ان دنوں کہ گراں　کال ہے شہر میں پڑا کہ سماں

کال کیا شے ہے کسکو کہتے ہیں بھوک　بھوک میں کیونکر مرتے ہیں مفلوک

سیر بھوکے قدر کیا سمجھے
اسکے نزدیک سب ہیں پیٹ بھرے

اہل دولت کا سن چکے تم حال
اب سنو روداد اہلِ کمال

فاضلوں کو ہے فاضلوں سے عناد
پنڈتوں میں پڑے ہوئے ہیں فساد

ہے طبیبوں میں نوک جھوک سدا
ایک سے ایک کا ہے تھوک جدا

شاعروں میں بھی ہے یہی تکرار
خوشنویسوں کو ہے یہی آزار

لاکھ نیکوں کا کیوں نہ ہو اک نیک
دیکھ سکتا نہیں ہے ایک کو ایک

اس پہ طرّہ یہ ہے کہ اہلِ ہنر
دور سمجھے ہوئے ہیں اپنا گھر

ملی اک گانٹھ جس کو ہلدی کی
اس نے سمجھا کہ میں ہوں پنساری

نسخہ اک طب کا جسکو آتا ہے
سگے بھائی سے وہ چھپاتا ہے

جسکو ہے کچھ رمل میں معلومات
وہ نہیں کرتا سیدھے مُنھ سے بات

الغرض جسکے پاس ہے کچھ چیز
جان سے بھی سوا ہے اُسکو عزیز

قوم پر انکا کچھ نہیں احساں
انکا ہونا نہ ہونا ہے یکساں

سب کمالات اور ہنر اُن کے
قبر میں اُن کے ساتھ جائیں گے

قوم کیا کہہ کے ان کو روئے گی
نام پر کیونکہ جان کھوئے گی

تربیت یافتہ ہیں جو یاں کے
خواہ بی اے ہو اسمیں یا ایم اے

بھرتے حُبّ وطن کا گو دم ہیں
پر محبّ وطن بہت کم ہیں

قوم کو اُن سے جو اُمیدیں تھیں
اب جو دیکھا تو سب غلط نکلیں

بند اُس قفل میں ہے علم اُنکا
جسکی کنجی کا کچھ نہیں ہے پتا

کرتے پھرتے ہیں سیر گل تنہا
کوئی پاس ان کے جا نہیں سکتا

اہلِ انصاف شرم کی جا ہے
گر نہیں بخل یہ تو پھر کیا ہے

تم نے دیکھا ہے جو وہ سب کو دکھاؤ
تم نے چکھا ہے جو وہ سب کو چکھاؤ

اور جو دولت تمہارے پاس ہے آج — ہم وطن اس کے ہیں بہت محتاج
آپ شائستہ ہیں تو اپنے لئے — کچھ سلوک اپنی قوم سے بھی کیے
قوم پر کرتے ہو اگر احساں — تو دکھاؤ کچھ اپنا جوش نہاں
کچھ دنوں عیش میں خلل ڈالو — پیٹ میں جو ہے سب اُگل ڈالو
علم کو کر دو کو بہ کو ارزاں — ہند کو کر دکھاؤ انگلستاں
سُنتے ہو سامعین با تمکین — سُنتے ہو حاضرین صدر نشین
جو ہیں دُنیا میں قوم کے ہمدرد — بندۂ قوم ان کے ہیں زن و مرد
باپ کی ہے دُعا یہ ہر پسر — قوم کی میں بناؤں اس کو سپر
ماں خدا سے یہ مانگتی ہے مراد — قوم پر سے نثار ہو اولاد
بھائی آپس میں کرتے ہیں پیماں — تو اگر مال دے تو میں دوں جاں
اہلِ ہمّت کما کے لاتے ہیں — ہم وطن فائدے اُٹھاتے ہیں
کہیں ہوتے ہیں مدرسے جاری — دخل اور جن کے خرچ ہیں بھاری
اور کہیں ہوتے ہیں کلب قائم — مبحثِ حکمت و ادب قائم
نت نئے کُھلتے ہیں دواخانے — بنتے ہیں سیکڑوں شفاخانے
ملک میں جو مرض ہیں عالم گیر — قوم پر ان کی فرض ہے تدبیر
ہیں سدا اس اُدھیڑ بُن میں طبیب — کہ کوئی نسخہ ہاتھ آئے عجیب
قوم کو پہونچے منفعت جس سے — ملک میں پھیلیں فائدے جس کے
رسمِ بد کا اثر جہاں پایا — حملہ پر حملہ اُس پہ ہونے لگا
کہیں مجلس میں ہوتی ہے تقریر — کہیں مضمون ہوتے ہیں تحریر
لاکھ تدبیریں جی سے جوڑتے ہیں — آخر اس کو مٹا کے چھوڑتے ہیں
قوم کی خاطر اُنکے سب ہیں کام — خواہ اس میں سفر ہو خواہ مقام

سیکڑوں گل رخ اور مہ پارے
لاڈلے ماں کے باپ کے پیارے

جان اپنی لئے ہتھیلی پر
کرتے پھرتے ہیں بحر و بر میں سفر

شوق یہ ہے کہ جان جائے تو جائے
پر کوئی بات کام کی ہاتھ آئے

جس سے مشکل ہو کوئی قوم کی حل
ملک کا آئے کوئی کام نکل

کھپ گئے کتنے بن کے جھاڑوں میں
مر گئے سیکڑوں پہاڑوں میں

لکھے جب تک جئے سفرنامے
چل دیے ہاتھ میں قلم تھامے

گو سفر میں اُٹھائے رنج کمال
کر دیا پر وطن کو اپنے نہال

ہیں اب اُن کے گواہ حُبِّ وطن
در و دیوار پیرس و لندن

کہتے دنیا کا جسکو باغ جناں
وہ فرانس آج یا ہے انگلستاں

کام ہیں سب بشر کے ہم وطنو
تم سے بھی ہو سکیں جو مرد بنو

چھوڑو افسردگی کو جوش میں آؤ
بس بہت سوئے اُٹھو ہوش میں آؤ

قافلے تم سے بڑھ گئے کوسوں
رہے جاتے ہو سب سے پیچھے کیوں

قافلوں سے اگر ملا چاہو
ملک اور قوم کا بھلا چاہو

گر رہا چاہتے ہو عزّت سے
بھائیوں کو نکالو ذلّت سے

ان کی عزّت تمھاری عزّت ہے
اُن کی ذلّت تمھاری ذلّت ہے

قوم کا مبتذل ہے جو انساں
بے حقیقت ہے گرچہ ہے سلطاں

قوم دنیا میں جس کی ہے ممتاز
ہے فقیری میں بھی وہ با اعزاز

عزّت قوم چاہتے ہو اگر
جا کے پھیلاؤ ان میں علم و ہنر

ذات کا فخر اور نسب کا غرور
اُٹھ گئے اب جہاں سے یہ دستور

اب نہ سیّد کا افتخار صحیح
نہ برہمن کو شُدر پر ترجیح

ہوئی ترکی تمام خانوں کی
کٹ گئی جڑ بھی خاندانوں کی

قوم کی عزت اب ہُنر سے ہے — علم سے یا کہ سیم و زر سے ہے
کوئی دن میں وہ دَور آئے گا — بے ہُنر بھیک تک نہ پائے گا
نہ رہیں گے سدا یہی دن رات — یاد رکھنا ہماری آج کی بات
گر نہیں سُنتے قول حاؔلی کا — پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا

اُمید سے خطاب

بس اے نا اُمیدی نہ یوں دل بجھا تو — جھلک اے اُمید اپنی آخر دکھا تو
ذرا نا اُمیدوں کی ڈھارس بندھا تو — فسردہ دلوں کے دل آخر بڑھا تو

تیرے دم سے مُردوں میں جانیں پڑی ہیں
جلی کھیتیاں تو نے سرسبز کی ہیں

سفینۂ نوح طوفاں میں تو تھی — سکوں بخش یعقوب کنعاں میں تو تھی
زلیخا کی غمخوار ہجراں میں تو تھی — دل آرام یوسف کی زنداں میں تو تھی

مصائب نے جب آن کر اُن کو گھیرا
سہارا وہاں سب کو تھا ایک تیرا

بہت ڈوبتوں کو ترایا ہے تو نے — بگڑتوں کو اکثر بنایا ہے تو نے
اُکھڑتے دلوں کو جمایا ہے تو نے — اُجڑتے گھروں کو بسایا ہے تو نے

بہت تو نے پستوں کو بالا کیا ہے
اندھیرے میں اکثر اُجالا کیا ہے

تو ہی تجھ سے ہمت ہے پیر و جواں کی — بندھی تجھ سے ڈھارس ہر خورد و کلاں کی
تجھی پر ہے بنیاد نظم جہاں کی — نہ ہو تو تو رونق نہ ہو اُس دکاں کی

لگا پو ہے ہر مرحلے میں تجھی سے
روا رو ہے ہر قافلے میں تجھی سے

کسانوں سے کہ رہیں تو ہے بواتی جہازوں کو گرداب میں ہے کھواتی
سکندر کو دارا پہ ہے تو چڑھاتی فریدوں کو ضحاک سے ہے لڑاتی
چلے سب جدھر تو نے باگیں عناں کی
نظر تیری سیٹی پہ ہے کارواں کی

نوازا بہت بے نواؤں کو تو نے تو انگر بنایا گداؤں کو تو نے
دیا دست رس نارساؤں کو تو نے کیا بادشہ ناخداؤں کو تو نے
سکندر کو شانِ کئی تو نے بخشی
کلمبس کو دنیا نئی تو نے بخشی

وہ رہرو نہیں رکھتے جو کوئی ساماں خوردو زادسے جنکا خالی ہو داماں
نہ ساتھی کوئی جس سے منزل ہو آساں نہ محرم کوئی جو سُنے دردِ پنہاں
ترے بل پہ خوش ہیں اس طرح جاتے
کہ جا کر خزانے ہیں اب کوئی پاتے

زمیں جو تنے کو جب اُٹھتا ہے جوتا سمیں کا گماں تک نہیں جبکہ ہوتا
شب و روز محنت میں ہو جان کھوتا مہینوں نہیں پاؤں پھیلا کے سوتا
اگر موجزن اُسکے دل میں نہ تو ہو
تو دنیا میں غل بھوک کا چار سو ہو

بنے اس سے بھی گر سوا اپنے دم پر بلاؤں کا ہو سامنا ہر قدم پر
پہاڑ اک فزوں اور ہو کوہ غم پر گزرتی ہو جو کچھ گزر جائے ہم پر
نہیں فکر تو دل بڑھاتی ہے جب تک
دماغوں میں بو تیری آتی ہے جب تک

یہ سچ ہے کہ حالت ہماری زبوں ہے عزیزوں کی غفلت وہی جوں کی توں ہے

جہالت وہی قوم کی رہنموں ہے تعصب کی گردن پہ ملت کا خوں ہے

مگر اے اُمید اک سہارا ہے تیرا
کہ جلوہ یہ دنیا میں سارا ہے تیرا

سوالات

(۱) حالیؔ نے اُردو شاعری میں کیا اصلاح کی۔

(۲) کیا دورِ جدید کا آغاز حالیؔ سے ہو سکتا ہے؟

(۳) حالیؔ اور آزاد کا بہ حیثیت شاعر کے مقابلہ اور موازنہ کیجئے۔

مزید مطالعہ کے لئے

(۱) حالیؔ نمبر۔

(۲) "حالیؔ کی شاعری"

(۳) تنقیدی حاشیے۔ اندازے۔

اکبر الہ آبادی

خان بہادر سید اکبر حسین الہ آبادی نے (۱۸۴۶-۱۹۲۱ء) فارسی اور عربی کے ساتھ انگریزی علوم سے بھی واقفیت بہم پہونچائی۔ ترقی کرتے کرتے ۱۸۹۴ء میں جج عدالت خفیفہ کے عہدہ پر پہونچے۔ اور ۱۹۰۳ء میں پنشن لی وحید الہ آبادی تلمیذ آتش لکھنوی کے شاگرد تھے۔
اکبر کی شاعری کے پانچ دور ہیں پہلا دور مشق کا ہے اور زیادہ تر قدیم رنگ کی غزلوں پر مشتمل ہے۔ دوسرے دور میں تصنع کے بجائے

اصلیت اور واقفیت نمایاں ہوجاتی ہے تیسرے دور میں جدّت اور ظرافت کی فراوانی ہے غزلوں میں اخلاق اور تصوّف کا رنگ آگیا ہے چوتھا دور صحیح معنوں میں "لسان العصر" کی شاعری کا دور کہا جاسکتا ہے اس میں غزلیں کم ہیں واقعات حاضرہ پر تنقید کی گئی ہے اور ظرافت نے بڑھ کر طنز کی صورت اختیار کرلی ہے۔ پانچویں دور کی خصوصیات حقائق آگاہی پختگی، جدت طرازی، نکتہ چینی اور ایک شوخ سنجیدگی ہے جس کو داغ کی زبان میں ہنسا ہنسا کر اشکبار کرنا کہا جاسکتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے لکھا ہے کہ اکبر کی شاعری کی نمود و ترقی کا زمانہ اُنیسویں صدی عیسوی کا ربع آخر اور بیسویں صدی کا خمس اول ہے یہی زمانہ ہندوستان میں مغربیت کے انتہائے عروج کا ہے۔ ملک و قوم کی یہ حالت ہے کہ غدر کو فرد ہوئے چند سال گذر چکے ہیں۔ ہندوستان بیرونی مداخلت و تسلّط کے شکنجہ میں پورے طور پر کسا ہوا ہے۔ اسلامی اخلاق، اسلامی ادب، اسلامی شعائر مدّت ہوئی رخصت ہوچکے۔ عقائد میں تزلزل آچکا ہے ایمان کی مضبوطی ایک افسانۂ پارینہ رہ گئی ہے۔ نفس پروری اور عیش پرستی کی گرم بازاری ہے اس کے مقابلہ میں برطانیہ کی عظمت کا نقش ہر دل پر بیٹھا ہوا ہے۔ دادخواہی کے لئے انگریزی عدالتیں ہیں۔ تعلیم کے لئے انگریزی مدرسے ہیں علاج کے لئے انگریزی شفاخانے!! رسل و رسائل کے لیے انگریزی ڈاکخانے ہیں۔ مہاجنی کے لیے انگریزی کوٹھیاں اور بینک ہیں۔ ماضی سے واقفیت کے لیے انگریزوں کی کتابیں ہیں حال سے باخبر رہنے کے لیے انگریزوں کے اخبارات ہیں مستقبل کی پیشینگوئی کے لیے انگریزی

سائنس ہے۔ غرض جس طرف بھی رُخ پھرتا ہے حدِ نظر تک ایک غیر محدود ناتمنا ہی پرچم انگریزی اقبال کا لہراتا ہوا نظر آتا ہے سوتے ہوئے شخص کے کمرہ میں دفعتاً تیز روشنی کردی جائے تو وہ سمجھے گا کہ آفتاب نکل آیا۔ یہی حال اس وقت قوم کا تھا اضطراب قلب اختلال حواس واجتماع حوادث کے وقت دیو میں پری کا حُسن وجمال معلوم ہوا اور عجوز ہفتاد سالہ پر نازنین شانزدہ سالہ کا دھوکا ہوا۔ چنانچہ مسلمانوں نے اپنے علوم وفنون شعائر ورسوم اور عقائد وخیالات کو یکسر اوہام کا لقب دیکر انگریزیت کے صنم دلربا پر نثار کر دیا۔

اکبر کی شاعری اس زمانہ کا آئینہ ہے۔ اس وقت نوحہ خوانی کا دور ایک حد تک ختم ہو چکا تھا اور قلوب پر صبر واطمینان نے تسلّط جما لیا تھا۔ زخم مرورِ ایام سے مندمل تو ہو چکے تھے لیکن داغ باقی تھے اس صورت میں ''آہ''، ''طنز'' ہی کی صورت اختیار کر سکتی تھی۔ چنانچہ اکبر نے ہنسا ہنسا کر اشکبار کیا اور رُلا رُلا کر ہنسایا۔ اس وقت نئی اور پُرانی تہذیب کی آویزش جاری تھی اور ہر شعبۂ زندگی میں نہایت سرعت کے ساتھ تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ ان باتوں کا نتیجہ ایک کشمکش اور ردّ عمل کی صورت میں ظاہر ہوا اکبر کے یہاں یہ باتیں پورے طور پر جلوہ گر ہیں اور اس وقت کی حالت کی صنعت گیرانہ طور پر مصوری کی گئی ہے انھوں نے معاشرت میں خرابیاں دیکھیں، کورانہ تقلید کی برائیوں ماضی اور مستقبل کی طرف سے بیگانگی اور مذہب وملّت کی کس مپرسی کو محسوس کیا اور اس کے خلاف آواز اُٹھائی لیکن یہ نکتہ چینی ظرافت کے پیرایہ میں کی جو مُومُتر اور ''بدمستی'' کے عالم میں سننے والوں کو ناگوار بھی نہیں ہوتی۔ چند

اشعار ملاحظہ ہوں۔

یوسف کو نہ سمجھے کہ حسیں بھی ہے جواں بھی
شاید نرے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی

سرافرازی ہوا دنٹوں کی تو گردن کاٹئے انکی
اگر بندر کی بن آئے تو فیض ارتقا کہیے

سینے ادھر ایسے کہ سہیں جو رِ رفل بھی
کان ان کے وہ نازک کہ گراں میری غزل بھی

تھے معزز شخص لیکن ان کی لائف کیا لکھوں
گفتنی درج گزٹ، باقی جو ہے ناگفتنی

اکبر کے اُردو شاعری کے حالات کے سلسلے میں بحث کی جا چکی ہے ان کی غزلوں کا بھی لہجہ بعد میں بالکل بدل گیا۔ ان کے تغزل میں فلسفیانہ رنگ، وسعت عمق، پاکیزگیٔ خیال سچائی اور اعتدال پایا جاتا ہے اور بعض بعض جگہ، پیامی، اصلاحی اور ظریفانہ انداز بھی نمایاں ہو گیا ہے۔
(نئی شاعری خواجہ احمد فاروقی)

اپنے فرزند سے

عشرتِ گھر کی محبت کا مزہ بھول گئے
کھا کے لندن کی ہوا عہدِ وفا بھول گئے

موم کی پتلیوں پر ایسی طبیعت پگھلی
چمنِ ہند کی پریوں کی ادا بھول گئے

کیسے کیسے دلِ نازک کو دُکھایا تم نے
خبر فیصلۂ روزِ جزا بھول گئے

نقلِ مغرب کی ترنگ آئی تمھارے دل میں
اور یہ نکتہ کہ مری اصل ہے کیا بھول گئے

قطعہ

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبرؔ
مجھے تو ان کی خوش حالی سے ہے یاس

یہ عاشق شاہد مقصود کے ہیں
نہ جائیں گے ولیکن سعی کے پاس

سناؤں تم کو اک فرضی لطیفہ
کیا ہے جس کو میں نے زیب قرطاس

کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے
کہ بیٹا تو کرے گر ایم۔ اے پاس

تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے
بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس

کہا مجنوں نے یہ اچھی سُنائی
کجا عاشق کجا کالج کی بکواس

کجا یہ فطرتِ جوشِ طبیعت
کجا ٹھونسی ہوئی چیزوں کا احساس

بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے
ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس

یہ اچھی قدردانی آپ نے کی
مجھے سمجھا ہے کوئی ہرچرنداس

دل اپنا خون کرنے کو ہوں موجود
نہیں منظور مغزِ سر کا آماس

یہی ٹھیری جو شرطِ وصلِ لیلیٰ
تو استعفا مرا باحسرت و یاس

سوالات

(۱) کیا اکبر قدامت پسند تھے۔

(۲) اکبر نے طنز اور ظرافت کو اصلاح کے لیے کیوں اختیار کیا۔ اس سے کیا نتائج مرتب ہوئے۔

(۳) "اکبر نے ہمیں ہنسا ہنسا کر اشکبار کیا" اس کی وضاحت کیجئے۔

برج نرائن چکبست

آپ کا نام برج نرائن۔ خاندانی لقب چکبست تھا۔ شاعر تھے اور بہترین شاعر تھے۔ مگر نہ معلوم تخلّص کیوں نہیں اختیار فرمایا۔ ۱۸۸۲ء میں یہ بمقام فیض آباد پیدا ہوئے۔ اور چند ہی سال بعد اپنے بزرگوں کے وطن قدیم یعنی لکھنؤ میں چلے گئے۔ ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔ اے کی ڈگری لی۔ اور ۱۹۰۸ء میں قانون کا امتحان پاس کر کے وکالت شروع کر دی۔ اور چند روز میں اس پیشے کی حیثیت سے آپ کا

نام لکھنؤ کے مشہور وکیلوں کی فہرست میں شامل ہوگیا۔

آپ کو اوائل عمر ہی سے شعر کا شوق رہا۔ اور ہمیشہ مشق سخن کرتے رہے مگر کبھی تخلص نہیں رکھا۔ آپ کو نہ صرف نظم سے بلکہ ادبیات اُردو سے ایک خاص ذوق تھا۔ تنقیدی ریسرچ کے مضامین لکھنے میں ایک خاص ملکہ رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک زمانہ میں اسی ذوق کو پورا کرنے کے لیے آپ نے ایک رسالہ "صبح اُمید" کے نام سے جاری کیا جس میں اس قسم کے بہت سے بہترین مضامین شائع ہوئے اور عرصہ تک کامیابی کے ساتھ جاری رہا۔ مگر آخر کار بند ہوگیا۔ آپ نے سابق اودھ پنچ کی جلدوں میں سے بہترین مضامین کا بھی انتخاب کیا تھا جس کو دو جلدوں میں چھپوا دیا گیا اس کے دیکھنے سے ہندوستان کے ظریف اخبار اودھ پنچ سابق کی عظمت کا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ آپ نے ۱۹۰۵ء میں مثنوی گلزار نسیم کو ایڈٹ کرکے نہایت صحت کے ساتھ شائع کرایا تھا۔ جس پر رسالہ دلگداز میں مولانا عبدالحلیم شرر نے اعتراضات کئے۔ اور پھر آپ نے جوابات دیے اس کے بعد وہ ہنگامہ برپا ہوا کہ ہندوستان کے تمام ادیبوں کو قریب قریب اُس میں حصّہ لینا پڑا۔ غرض کہ آپ کی زندگی ادبی مشاغل کی فضا میں صرف ہوئی۔ اور آخر کار آپ ۱۲؍ فروری ۱۹۲۶ء کو جب کہ آپ رائے بریلی ایک مقدمہ کی پیروی کے لیے تشریف لے گئے تھے اور وہاں سے واپس آرہے تھے کہ یکایک اسٹیشن پر آپ کے اوپر فالج گرا اور زبان بند ہوگئی۔ اور پھر مرض کا اشتداد یہاں تک ہوا کہ اُسی روز شام کو ۷ بجے اسٹیشن رائے بریلی ہی آپ کا انتقال ہوگیا۔ اور پھر آپ کی لاش موٹر میں رکھ کر لکھنؤ میں لائی گئی۔

آپ کے شعر کے متعلق حسب ذیل خیالات تھے خیالات کی تازگی زبان میں شاعرانہ لطافت۔ الفاظ میں تاثیر کا جوہر ہونا شعر کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ آپ نے ہمیشہ ان باتوں کا اپنی شاعری میں خیال رکھا ہے۔ اور آپ کے مجموعی کلام میں۔ بلندی مضمون۔ جدت خیال۔ عمق جذبات۔ شعر کی حقیقت اور واقعیت پر مبنی ہونے فلسفیت وغیرہ کی کافی جھلک موجود ہے۔ نثر کے مضامین کا مجموعہ مضامین چکبست اور نظم کا مجموعہ موسوم بہ صبح وطن شائع ہو گیا ہے اس میں بہترین نظمیں موجود ہیں۔ اُنھیں نظموں میں سے مندرجۂ ذیل ایک نظم درج کی جاتی ہے۔

بہارستان کشمیر کی یاد میں

ہاں نورِ ازل جلوۂ گفتار دکھا دے ہاں شمع زباں مطلع انوار دکھا دے
ہاں طبعِ رواں قلزمِ زخار دکھا دے ہاں رنگِ سخن گلشنِ بے خار دکھا دے

گلزار معانی کا مہکتا نظر آئے
طوطی چمنستان میں چہکتا نظر آئے

ہو حُسن بیاں میں چمنستاں کا تجمل ہر نکتۂ رنگیں نظر آئے صفتِ گُل
ہر معنیٔ پیچیدہ بنے طرۂ سُنبل عاشق ہوں سخن پر جو سُنیں صورتِ بُلبُل

جو شعر ہو طوبیٰ کا وہ ثانی نظر آئے
کوثر کی طبیعت میں روانی نظر آئے

ہاں طبعِ رسا خاطرِ احباب ہے منظور بس شرم کا بُرقع رُخِ معنی سے ہو اب دور
دکھلا دے سرِ بزم تجلی سرِ طُور غش صورتِ موسیٰ ہوں جو سُن پائیں یہ مذکور

منکر جو ہیں فرعون صفت اعجاز سخن کے
ہوں آج وہ قائل مرے انداز سخن کے

ہاں طعنہ و تشنیع کی پروا نہیں مجھ کو
تحسین و ستائش کی تمنا نہیں مجھ کو
نیرنگیٔ افلاک کا شکوا نہیں مجھ کو
کچھ فکر ہو شہرت کی یہ سودا نہیں مجھ کو
ڈوبا ہوا ہوں مثلِ سخن رنگ سخن میں
گُل ہو کے میں رہتا ہوں لطافت کے چمن میں

اس وقت کا اب ہوش بھی پورا نہیں زنہار
سرمست مجھے رکھتی ہے جب بادۂ اشعار
لیکن نہ رہا مجھ کو تعلّی سے سروکار
ہے میری خموشی پہ فدا عالم گفتار
اس مے نے کچھ ایسا مجھے مدہوش کیا ہے
خود اپنے تئیں میں نے فراموش کیا ہے

عالم سے جُدا ہے مری تقریر کا عالم
بدبینوں پہ حیرت سے ہے تصویر کا عالم
رنگیں سخنی سے ہے یہ تحریر کا عالم
ہر صفحہ پہ ہے گلشنِ کشمیر کا عالم
کیفیتِ گلزار سمائی ہے نظر میں
اس خطۂ دلکش کا ہی سودا ہے سر میں

پانی میں ہے چشموں کے اثر آب بقا کا
ہر نخل پہ عالم خضرِ سبز قبا کا
جو پھول ہے گلشن میں وہ ہے نور خدا کا
سائے میں شجر کے ہے اثر ظلِّ ہما کا
مبدا اکرم عام کی ہر جوئے رواں ہے
سرچشمۂ فیضِ چمن آرائے جہاں ہے

وہ موج ہوا کا حرکت ابر کو دینا
چشموں سے پہاڑوں کے وہ اُڑتا ہوا پھینا
گاتے ہوئے ملّاحوں کا وہ کشتی کو کھینا
ڈال کا وہ سرِ شام ادھر کروٹیں لینا

وہ عکس چراغوں کا جھلکتا نظر آنا
پانی کا ستارہ وہ بھی چمکتا نظر آنا

ہر لالۂ کہسار ہے شکلِ گُلِ راحت — داغ اُس کے ہیں خالِ رُخِ حورانِ مسرّت
کیا سبزۂ خوشرنگ ہے سرمایۂ عشرت — دل کے لئے ٹھنڈک ہو جگر کیلئے فرحت

ایسا نہیں قدرت نے کیا فرش کہیں پر
اس رنگ کا سبزہ بھی نہیں روئے زمیں پر

وہ صبح کو کہسار کے پھولوں کا مہکنا — وہ جھاڑیوں کی آڑ میں چڑیوں کا چہکنا
گردوں پہ شفق کو وہ پہ لالے کا لہکنا — مستوں کی طرح ابر کے ٹکڑوں کا بہکنا

ہر پھول کی جنبش سے عیاں نازبری کا
چلنا وہ دبے پاؤں نسیمِ سحری کا

وہ طائرِ کہسار لبِ چشمۂ کہسار — وہ سرد ہوا وہ کرمِ ابرِ گہربار
وہ میوۂ خوشرنگ وہ سرسبز چمن زار — اک آن میں صحت ہو جو برسوں کا ہو بیمار

یہ باغِ وطن رشکِ گلزارِ جناں ہے
سرمایۂ نازِ چمن آرائے جہاں ہے

ہے خطۂ سرسبز میں اک نور کا عالم — ہر شاخ و شجر پر شجرِ طور کا عالم
پروین پہ ہے خوشۂ انگور کا عالم — ہر خار پہ بھی ہے مژۂ حور کا عالم

نکلے نہ صدا ایسی مغنّی کے گلو سے
آتی ہے جو آوازِ ترنّم لبِ جو سے

میوؤں سے گراں بار وہ اشجار کے ڈالے — کھرے ہوئے وہ دامنِ کہسار پہ لالے
اُڑتے ہوئے بالائے ہوا برف کے جھالے — دیکھے جو کوئی دور سے ہیں روئی کے گالے

وہ ابر کے ٹکڑوں کا تماشا شجروں میں
جھرنوں کی صدائیں وہ پہاڑوں کے دَرّوں میں

چھوٹے ہوئے اس باغ کو گذرا ہے زمانا
تازہ ہے مگر اُس کی محبت کا فسانا
عالم نے شرف جس کی بزرگی کا ہے مانا
اُٹھتے تھے اسی خاک سے وہ عالم ودانا

تن جس کا ہے پیوند اب اس پاک زمیں کا
رگ رگ میں ہماری ہے رواں خون اُنھیں کا

ہاں میں بھی ہوں بُلبُل اُسی شاداب چمن کا
ہے چشمۂ فردوس یہ عالم ہے دہن کا
کس طرح نہ سرسبز ہو گلزار سخن کا
ہے رنگ طبیعت میں چمن زار وطن کا

تازے ہیں مضامیں بھی طبیعت بھی ہری ہے
ہاں گلشنِ قومی کی ہوا سر میں بھری ہے

سوالات

(۱) چکبست کی قومی نظموں کا کیا مرتبہ ہے۔

(۲) ان کے کلام کی خصوصیات کیا ہیں۔ وہ کن شاعروں سے متاثر ہوئے ہیں۔ مثالیں دے کر سمجھائیے۔

مزید مطالعہ کے لیے

یادِ چکبست۔

ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال

آپ کا نام محمد اقبال اور تخلص اقبالؔ ہے۔ آپ نومسلم شیخوں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ آپ کے جدِّ امجد جو کشمیری پنڈتوں میں سے تھے قریب ڈھائی سو برس پہلے مسلمان ہوگئے تھے آپ ۱۸۷۶ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے۔ رسم زمانہ کے مطابق کچھ دنوں مکتب میں پڑھا۔ پھر اپنے قصبے ہی کے اسکول میں انٹرنس پاس کیا اور اس کے بعد مشن کالج لاہور میں ایف۔ اے تک پڑھ کر گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے ایم۔ اے نہایت امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ پھر آپ ولایت تشریف لے گئے۔ لندن کی کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفہ کی اور جرمن میونک یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کر کے پھر لندن میں بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے واپس آئے اور چند روز اُسی کالج میں جہاں آپ پہلے طالب علم۔ اور پھر چند روز پروفیسر رہے تھے۔ پھر پروفیسر ہوگئے۔ اس کے بعد بیرسٹری شروع کر دی اور اس میں کامیاب رہے۔

اگرچہ ان کو شعر گوئی کا شوق اول ہی سے تھا۔ مگر وہ صرف اُن کی ذات یا اُن کے ساتھی طالب علموں تک محدود تھا۔ مگر ۱۸۹۶ء کے حمایت الاسلام کے جلسے میں آپ نے اپنی نظم نالۂ یتیم پڑھ کر اپنی شہرت کا سنگ بنیاد رکھ دیا اور پھر اس انجمن کے ہر

سالانہ جلسے میں آپ کچھ نہ کچھ پڑھتے رہے۔

آپ کا ذوق سخن سنجی اگرچہ اول سے پختہ تھا۔ مگر آپ نے بہ نظر احتیاط پہلے اپنے کلام پر مرزا ارشد گورگانی اور پھر مرزا داغ دہلوی سے اصلاح لی۔ آپ کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اکثر کلام نہایت جوشیلا مُردہ قوم کے مُردہ جذبات اُبھارنے والا ہوتا ہے۔ تاریخی جھلک۔ واقعیت۔ فلسفہ اُس کو اور وقیع بنا دیتا ہے۔ فارسی ترکیبیں اور الفاظ کی شوکت اس کو اور بھی بلند کرکے دکھاتی ہے۔ تصوّف کی چاشنی سے بھی وہ خالی نہیں ہوتا۔ بڑی بات یہ ہے کہ ان کا ہر شعر دُنیا کو پیغام عمل دیتا داستان پارینہ کی عبرتناک تصویریں اس انداز سے دکھاتا ہے کہ وہ اپنے رنگ کے سبب سے جدا اشاعر معلوم ہوتے ہیں۔ غزلوں کے علاوہ آپ کی نظمیں جن کا اُردو مجموعہ بانگ درا کے نام سے موسوم ہے بہت ہی بے مثل ہیں آپ کی ایک مخصوص نظم شکوہ ہندوستان کے مسلمان بچوّں تک کی زبان پر ہے اور بتاتا ہے کہ ایک قومی شاعر کیا کہہ سکتا ہے۔ فارسی میں اسرار خودی۔ رموز بے خودی آپ کی مثنویاں مشہور ہیں آپ کا فارسی کلام بھی شائع ہوگیا ہے۔

ادبی خدمات کے صلے میں ۱۹۲۲ء میں آپ کو سر کا خطاب ملا۔

انتخاب از مسجد قرطبہ

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات
سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات

سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

سلسلۂ روز و شب سازِ ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بمِ ممکنات

تجھ کو پرکھتا ہے یہ مجھ کو پرکھتا ہے یہ
سلسلۂ روز و شب صیرفیِ کائنات

تو ہو اگر کم عیار، میں ہوں اگر کم عیار
موت ہے تیری برات، موت ہے میری برات

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کارِ جہاں بے ثبات، کارِ جہاں بے ثبات

اول و آخر فنا باطن و ظاہر فنا
نقشِ کہن ہو کہ نو منزلِ آخر فنا

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

عشق دمِ جبرئیل عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام

عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام

عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود
عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات عشق سے نورِ حیات

وادیٔ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

سادہ و پرسوز ہے دخترِ دہقاں کا گیت
کشتیٔ دل کے لیے سیل ہے عہدِ شباب

آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

پردہ اٹھا دوں اگر عالمِ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب
صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

"فرمانِ خدا"

فرشتوں سے

اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو
حق را بسجودے صنماں را بطوافے بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو

گُلِ رنگیں

تو شناسائے خراشِ عقدۂ مشکل نہیں اے گُلِ رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں
زیبِ محفل ہوں شریکِ شورشِ محفل نہیں یہ فراغت بزمِ ہستی میں مجھے حاصل نہیں

اس چمن میں میں سراپا سوز و سازِ آرزو
اور تیری زندگانی بے گدازِ آرزو

توڑ لینا شاخ سے تجھ کو مرا آئیں نہیں
یہ نظر غیر از نگاہِ چشمِ صورت بیں نہیں

آہ یہ دستِ جفا جو اے گلِ رنگیں نہیں
کس طرح تجھ کو یہ سمجھاؤں کہ میں گلچیں نہیں

کام مجھ کو دیدۂ حکمت کے اُلجھیڑوں سے کیا
دیدۂ بلبل سے میں کرتا ہوں نظّارہ ترا

سو زبانوں پر بھی خاموشی تجھے منظور ہے
راز وہ کیا ہے ترے سینے میں جو مستور ہے

میری صورت تو بھی اک برگِ ریاض طور ہے
میں چمن سے دور ہوں تو بھی چمن سے دور ہے

مطمئن ہے تو پریشاں مثلِ بو رہتا ہوں میں
زخمیِ شمشیرِ ذوقِ جستجو رہتا ہوں میں

یہ پریشانی مری سامانِ جمعیت نہ ہو
یہ جگر سوزی چراغِ خانۂ حکمت نہ ہو

ناتوانی ہی مری سرمایۂ قوت نہ ہو
رشکِ جامِ جم مرا آئینۂ حیرت نہ ہو

یہ تلاش متصل شمعِ جہاں افروز ہے
توسنِ ادراکِ انساں کو خرام آموز ہے

جبریل اور ابلیس

جبریل

"ہمدمِ دیرینہ کیسا ہے جہانِ رنگ و بو؟"

ابلیس

"سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو!"

جبریل

"ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری جستجو
کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاکِ دامن ہو رفو؟"

ابلیس

آہ اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے
کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو!
اب یہاں میری گذر ممکن نہیں، ممکن نہیں
کس قدر خاموش ہے یہ عالمِ بے کاخ وکو
جس کی نومیدی سے ہو سوزِ درونِ کائنات
اس کے حق میں تقنطوا اچھا ہے یا لاتقنطوا؟

جبریل

"کھو دیے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند
چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو!"

ابلیس

"ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو،
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو

خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

فنونِ لطیفہ

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی صدا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

سوالات

(۱) اقبال کا پیام کیا ہے۔

(۲) خودی سے کیا مراد ہے۔

(۳) "اقبال انقلابی شاعر تھا" کیا یہ صحیح ہے۔

(۴) اقبال نے اُردو زبان پر کیا احسانات کئے۔

(۵) اقبال کے نزدیک عشق، خودی، خرد اور مردِ مومن کا کیا مفہوم ہے۔

سرورؔ جہان آبادی

آپ کا نام درگا سہاے تخلص سرورؔ تھا۔ حکیم پیارے لال کے بیٹے اور منشی کشن لال کے پوتے تھے۔ آپ کایستھ سکسینہ تھے۔ قصبۂ جہاں آباد ضلع پیلی بھیت آپ کا مولد و مسکن تھا۔ دسمبر ۱۸۷۳ء مطابق سمبت ۱۹۲۹ کو پیدا ہوئے۔ پہلے جہاں آباد ہی کے اسکول تحصیلی میں تعلیم پائی اور اول نمبر میں اُردو مڈل اسکول پاس کیا۔ اس کے بعد مولوی سید کرامت حسین متخلص بہارؔ سے آپ نے فارسی پڑھی۔ اور بہارؔ مرحوم ہی کی صحبت میں آپ کو شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اور آپ ہی سے مشقِ سخن کے ابتدائی مراحل طے کیے اول اول اساتذہ کا کلام بطور خود مدتوں دیکھتے رہے۔ ذوقِ سخن میں ایک صحیح ملکہ پیدا ہونے پر خود بھی شعر کہنے لگے۔ اس کے بعد انگریزی کا شوق پیدا ہوا۔ تو اس میں بھی مڈل پاس کر لیا۔ اور اس

زبان میں بھی کافی معلومات حاصل کرلی۔ طب آپ کا آبائی پیشہ تھا۔ اُس میں بھی کچھ دستگاہ بہم پہونچائی۔ اور اپنے قصبے ہی میں علاج و معالجہ کرتے رہے۔

۱۸۹۹ء میں آپ کا کلام ملک کے ادبی رسالوں میں چھپنا شروع ہوا اور پھر مدتوں چھپا کیا۔ چونکہ آپ کو اس فن کے سوا اور کوئی شوق ہی نہ تھا اور شب و روز مشق سخن جاری تھی۔ اس لئے دس گیارہ برس کے عرصے میں اچھا خاصہ سرمایۂ کلام جمع ہوگیا اور آپ کو اس کے شایع کرنے کی فکر ہوئی۔ چنانچہ اسی غرض کے لئے آپ نے ۱۹۱۰ء میں الہ آباد کا سفر کیا۔ اور شاکر میرٹھی کے مکان پر قیام کیا۔ ابھی کلام کی کتابت ہو رہی تھی۔ اور آپ کاپی پروف وغیرہ کی صحت کرنے کے لئے دوسری دفعہ الہ آباد جا رہے تھے کہ آپ کو ذات الجنب کا عارضہ لاحق ہوکر شدید تپ آئی۔ اور پھر یہی مرض موت بن گیا۔ چار پانچ دن کے عرصہ میں ۲ ردسمبر ۱۹۱۰ء کو عین شباب میں انتقال کیا۔ جیتے جی حتیٰ کہ عالم جاں کنی میں بھی آپ کو اپنے مجموعۂ کلام کے چھپنے کا خیال رہا۔ آخر آپ کے انتقال کے بعد جام سرور آپ کا مجموعۂ کلام انڈین پریس الہ آباد سے شایع ہوا۔

سرور نہایت راستباز۔ منکسر المزاج۔ متواضع۔ بلند ہمت تھے۔ مگر افسوس کہ آپ کے نصیب نے کبھی آپ کی مساعدت نہیں کی جس کی وجہ سے ہمیشہ پریشان روزگار رہے۔ اور سوائے اس تھوڑی سی زمینداری کے جو بزرگوں کی میراث تھی۔ اور کوئی معقول

آمدنی کا ذریعہ نہ ہوا۔ البتہ کچھ دنوں ایک رئیس زادے کے اتالیق رہے۔ یا دو تین سال تک رسالہ زمانہ کانپور کے دفتر میں کام کیا۔ باقی یہی شعر و شاعری ان کا شغل رہا۔ کہا جاتا ہے کہ ضرورت اور افلاس نے یہ غضب ڈھایا کہ اُنھوں نے اپنی زندگی میں اپنا کلام بھی فروخت کیا اور بہترین سے بہترین نظمیں دوسروں کے نام سے موسوم کر دیں۔

سرورؔ کے کلام میں ایک نیچرل شاعر کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ دلکش تشبیہیں۔ رنگین بیانی اور اس میں سوز و گداز اور حُسن بیان اُن کی شاعری کا اصلی جوہر ہیں۔ اگرچہ اُن نظموں میں کہیں کہیں خامیاں بھی رہ گئی ہیں مگر بعض لفظی غلطیوں کا پورے کلام پر اطلاق نہیں ہوتا۔ ایک زمانہ میں مختلف ادبی رسالوں میں آپ کا کلام چھپتا تھا۔ اور اُنھیں میں آپ کی بہت سی مشہور نظمیں شایع ہو چکی ہیں۔ اس جگہ صرف ایک نظم بیر بہوٹی درج کی جاتی ہے۔

بیر بہوٹی

آہ! او ننھے سے کیڑے نازشِ صحرا ہے تو
دشت میں اک سرخ چھوٹا سا گلِ رعنا ہے تو

صفحۂ ہستی پہ اک نقشِ تحیّر زا ہے تو
شعلۂ رخسارِ حسن کی چھوٹی سی اک دنیا ہے تو

برقِ عالم سوز کی ننھی سی ہیکل ہے کوئی
آتشِ یاقوت کی چھوٹی سی منقل ہے کوئی

کچھ عجب عالم ہے تیرے حُسن کے انداز کا
سُرخ ڈورا ہے کسی چشمِ فسوں پرداز کا

قطرۂ مضطر ہے خونِ کشتگانِ ناز کا
قلبِ خوں گشتہ ہے مژگاں پر کسی جانباز کا

یا شفق کا کوئی ٹکڑا ہے زمیں پر جلوہ گر
جام زریں میں ہے یا صہبائے احمر جلوہ گر

گل بداماں ہے شفق میں شعلۂ تنویرِ حسن — خونِ عاشق یا زمیں پر ہے گریباں گیرِ حسن
یا عقیقِ سُرخ کی چھوٹی سی ہے تعمیرِ حسن — نقشِ نیرنگ فسوں ہے یا کوئی تصویرِ حسن

جلوۂ گل ہے فضائے وادیٔ پُرخار میں
سُرخ تکمہ ہے قبائے سبزۂ کہسار میں

محضرِ خونِ شہیداں ہو ترا دامانِ سُرخ — یا ہے خونِ کشتگانِ عشق کا عنوانِ سُرخ
یا کسی کے ناوکِ پُرخوں کا ہے پیکانِ سُرخ — اشکِ گلگوں یا ہو زیبِ پنجۂ مژگانِ سُرخ

رنگ آمیزی ہے قدرت کی تری تصویر میں
اک دل آویزی ہے قدرت کی تری تصویر میں

حُسن میں تیرے ہے اے ناظورۂ حُسن آفریں — فندقِ پائے حسیناں کی ادائے دل نشیں
جلوۂ رُخ سے ترے گلگوں ہے دامانِ زمیں — بزمِ صحرا میں ہے تو جامِ شرابِ آتشیں

بادۂ گلگوں ترے چھوٹے سے پیمانے میں ہے
عالمِ نیرنگ افسوں تیرے میخانے میں ہے

وادیٔ پرخار میں اک مجمرِ سوزاں ہے تو — دامنِ کہسار میں اک شعلۂ عریاں ہے تو
کشتِ زارِ حُسن میں اک دانۂ مرجاں ہے تو — یا کسی گلگوں قبا کا گوشۂ داماں ہے تو

ناز ہے صحرا کو تیری شوخیٔ رفتار پر
دوڑتا ہے خوں کا قطرہ سبزۂ کہسار پر

گل بداماں ہے کوئی دوشیزۂ کمسن مگر — ہلکی ہلکی سُرخ پھولوں کی ہو چادر دوش پر
وقفِ رعنائی ہے یا کوئی عروسِ سیم بر — روئے زیبا پر ہے غازہ سُرخ جوڑا زیب بر

لوٹتا ہے کوئی بسمل سبزۂ بیگانہ پر
یا مئے گلگوں کا قطرہ ہے لب پیمانہ پر

جلوۂ گُل سے ہے رنگیں روئے زیبائے بہار نازنیں ہے یا کوئی محو تماشائے بہار
یا مئے گل رنگ سے گلگوں ہے مینائے بہار یا ہے آغشتہ بخوں داغ سویدائے بہار

سبزۂ کہسار نے یا لعل اُگلا ہے کوئی
چن رہی ہے پھول یا دوشیزۂ رعنا کوئی

سوالات

(۱) سرور، چکبست اور اقبال کا موازنہ کیجیے۔
(۲) سرور پر کن شعرا کا کیا اثر پڑا؟
(۳) سرور کی شاعرانہ خصوصیات بیان کیجیے۔
(۴) "سرور کے کلام میں تنوع بہت ہے" بحث کیجیے۔

بے نظیر شاہ

سید محمود بے نظیر وارثی (۱۸۶۳ء تا ۱۹۳۰ء) کا وطن کڑا مانک پور ضلع الٰہ آباد تھا لیکن حیدر آباد کو اپنا گھر بنا لیا تھا۔ کچھ دنوں علی گڈھ میں بھی قیام رہا۔ عربی اور فارسی میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ غزل میں وحید الٰہ آبادی اور مثنوی میں امیر مینائی سے مشورہ لیتے تھے طبیعت پر صوفیانہ رنگ غالب تھا جو اُن کی غزلوں میں نمایاں ہے جدید اردو شاعری کی تحریک سے بھی متاثر ہوئے اور بہت سی نیچرل نظمیں لکھی۔ ایک مثنوی الکلام لکھی جس کا موضوع تصوف اور مقصد فرضی ہے۔ یہ استعادہ کے

پیرایہ میں لکھی گئی ہے اور بہت مقبول ہے

بے نظیر شاہ کی نظموں میں مصوری، منظر کشی داخلی اور خارجی رنگ کا میل جول، سادگی اور حسنِ ادا ہے جس نے اُن کے کلام میں حد درجہ دلفریبی اور دلکشی پیدا کر دی ہے۔

تارے

کہاں ہے تو اے ساقیٔ بزم زیب — کہ تاروں بھری رات ہے دل فریب

کواکب پہ افلاک پھولے ہوئے — کنول حوضِ گردوں میں پھولے ہوئے

سمندر میں بہتے ہوئے یہ چراغ — بنے صحنِ گردوں میں تاروں کا باغ

نہیں چاند کا گو فلک پر نزول — کھلے ہیں مگر چاندنی کے یہ پھول

مسہری سجی قدرتِ پاک کی — بسی سیج پھولوں سے افلاک کی

قنادیل روشن عجائب نگار — مصابیحِ آیاتِ پروردگار

ستاروں کا یہ عکس تالاب میں — کہ لہراتی ہیں بجلیاں آب میں

تناسب سے قدرت نے چھوٹے بڑے — زبرجد کے گنبد میں ہیرے جڑے

یہ خورشیدِ تاباں کے آنکے ہوئے — گہر چترِ گردوں میں ٹانکے ہوئے

غضب جگمگاتی ہوئی فردیاں — بنا کامدانی کا تھا آسماں

بھری بوٹیوں سے ردائے فلک — بنی بیل خود کہکشاں کی سڑک

شبِ تار کی شال تانے ہوئے — جہاں نیند کی دل میں ٹھانے ہوئے

مگر چشمِ انجم جھپکتی نہیں — ستاروں کی بوندیں ٹپکتی نہیں

کچھ ایسا ہی خوفِ شبِ تار ہے — کہ ہر نجم اک چشمِ بیدار ہے

کھلے کوڑیالے سرِ کوہسار — کہ شبنم سے بھیگا ہوا سبزہ زار

جو تارے رہتے ہیں ان میں رواں — وہ ہیں اُن کی ترتیب کے پاسباں

جو ثابت ہیں محور بدلتے نہیں / کہ گرد اپنے پھرتے ہیں چلتے نہیں

مرتب جو یہ شکلِ تنجیم ہے / مہ و سال کی اُن سے تقسیم ہے

ہُوا بوجھ سب کا سنبھالے ہوئے / فضا میں کُرُوں کو اُچھالے ہوئے

بہم ان میں جو ربطِ جذبات ہے / علیٰ قدرِ جسم و مسافات ہے

کشش ان میں ہے اور تاثیر بھی / جداگانہ تکثیف و تنویر بھی

کچھ آباد کچھ ان میں خالی بھی ہیں / جلالی بھی ہیں کچھ جمالی بھی ہیں

وسیع اس قدر ہے فضائے جہاں / ہیں ذرّوں سے کم یہ کُرے بے گماں

تپش دن کو خورشیدِ تاباں کی تھی / خبر کس کو اس بزمِ شایاں کی تھی

فضا آبِ انجم سے دھوئی ہوئی / شبِ ماہ حیرت میں کھوئی ہوئی

آمدِ ابر

گھٹا اُودی اُودی سی کیا چھا گئی / بہارِ چمن رنگ پر آ گئی

پروں کو اِدھر مور تولے ہوئے / گھٹائیں اُدھر بال کھولے ہوئے

وہ کوئل غضب نے بجاتی ہوئی / پپیہوں سے تانیں لڑاتی ہوئی

ہَوا دوش پر شال ڈالے ہوئے / گھٹاؤں کے آنچل سنبھالے ہوئے

گھٹا میں وہ بگلوں کی ہر سو قطار / کہ ظلمت میں آبِ حیات آشکار

سیاہی میں یہ اُجلی اُجلی لکیر / رواں دامنِ کوہ میں جوئے شیر

یہ کہسار میں راہ چھوٹی ہوئی / سڑک سنگِ مرمر کی کوٹی ہوئی

زمین و فلک پر ہے مستی کا شور / گرجتے ہی بادل کے چلّائے مور

کبھی ابر گریاں کبھی خندہ زن / ہے دیوانے کا سوانگ چرخِ کہن

فلک پر گرجتا ہے ابرِ مطیر / زمیں پر نہ کیوں رِند گائیں گمبھیر

ماہتاب

اُفق پر سرِ شام ہی ماہتاب
وہ چمکا اُٹھا کر بسنتی نقاب

درختوں پہ چاندی سی چڑھنے لگی
تجلّی بھی اٹھلا کے بڑھنے لگی

روپہلی کرن آسماں پر تمام
اُڑانے لگی ریزۂ سیم خام

پڑی پانی پر چاندنی کی جھلک
دکھانے لگی موجِ دریا چمک

وہ رِل مِل کے ابرک شعاعِ قمر
چھڑکنے لگی سطحۂ آب پر

برسنے لگا نور افلاک سے
تجلّی اُبلنے لگی خاک سے

ہوا اس قدر روشنی کا وفور
بنی ہر کرن تارِ بارانِ نور

تجلّی کثافت کو دھونے لگی
مکانوں میں قلعی سی ہونے لگی

بنے آئینہ سارے دیوار و در
سفیدی پھری ہر در و بام پر

چاندنی رات

وہ مہتاب کی آسماں پر نمود
مزیّن کواکب سے چرخِ کبود

وہ کرنوں کی شبنم کے اندر بہار
اُڑایا ہے چاندی کا گویا غبار

لرزتی ہے پانی پہ یہ چاندنی
کہ دریا میں بجلی کی ہے روشنی

وہ لہریں کہیں تلملاتی ہوئیں
چمک آئینے کی دکھاتی ہوئیں

نہیں تیرگی نام کو بھی کہیں
کہ عکسِ تجلّی ہے ساری زمیں

رواں ہے یہ چاروں طرف موجِ نور
کہ اُڑتے ہیں دن کی طرح کچھ طیور

مگر چھوٹے چھوٹے ستارے ہیں ماند
کہ آج اپنے جلوہ میں ہے پورا چاند

شعاعوں کا وہ جگمگانا کہیں
ستاروں کا آنکھیں چرانا کہیں

گرا چھن کے پتّوں سے نورِ قمر
کہ ہیرے کے ٹکڑے پڑے ہیں ادھر

ہوا بچھے کاری کا یہ اہتمام
کہ مرمر پہ ہے سنگِ موسیٰ کا کام
یہ سایے ہیں اوراق سے نور کے
کہ گُل سنگ موسیٰ پہ بلور کے
کہیں چھپاتے ہیں کچھ کچھ طیور
کہیں شور کوؤں کا ہے دُور دور
ستارے جو ذرہ کے ٹوٹے ادھر
وہ مہتاب کے پھول تھے سر بسر
صفا بام و در میں سمائی ہوئی
درختوں پہ حیرت سی چھائی ہوئی
یہ کہتا ہے ہر اک شجر کا سکوت
سُبحانَ حیِ الّذی لایموت

چاندنی کی بہار

ہے اس ناز سے چاندنی جلوہ گر
کہ سکتے کے عالم میں ہے ہر شجر
تجلّی سے وادی یہ معمور ہے
کہ موجِ ہوا موجۂ نور ہے
وہ پھول اُجلے اُجلے ہیں جو سامنے
کٹوری سی چاندی کی سر پہ لئے
دکھاتے ہیں اس وقت کیسی بہار
کہ ہوں ٹوٹ کر جن پہ تارے نثار
چمک ریگ پر صحن بتّور کی
بچھائے ہوئے چاندنی نور کی
یہ عالم جو دیکھا تو شکل کتاں
ہوا پارہ پارہ دلِ عاشقاں
وہ بھیگی ہوئی آبِ رحمت سے رات
کہ تر دامنوں کی ہو جس سے نجات
وہ شبنم کی خنکی وہ ٹھنڈی ہوا
وہ اشجارِ آبِ رواں کی صفا
وہ شاخوں کا جھکنا لچک کر کہیں
وہ لہروں کا اٹھنا چمک کر کہیں
وہ میدان میں چاندنی کا سماں
وہ شبنم کا گرد اُس کے کچھ کچھ دھواں
نجوم و قمر کا وہ عکس آب میں
وہ پانی میں جلتی ہوئی مشعلیں
وہ ہر سمت چھایا ہوا نورِ بدر
وہ شب لیلۃ القدر کو جس کی قدر

سوالات

(۱) اُردو میں منظر کشی کے نمونے کہاں کہاں ملتے ہیں؟

بے نظیر شاہ کا اس صنف میں کیا مرتبہ ہے۔

(۲) بے نظیر شاہ کی تشبیہات و استعارات پر ایک نوٹ لکھئے۔

عظمت اللہ خاں

دنیائے شاعری میں گیتوں کو سرمستی اور سوز گداز کے اعتبار سے بڑا درجہ حاصل ہے۔ اُردو میں عظمت اللہ خاں نے اس قسم کی شاعری میں جان ڈالدی ہے۔ ان کے کلام میں وہ تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں جو بھاشا میں عام ہیں ان کا مجموعہ "سریلے بول" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ شوق، قدوائی، آرزو اور رضا لکھنوی نے بھی مختلف طریقوں سے اس طرح کی جذبات نگاری کی سعی کی ہے لیکن عظمت ایک نئے دبستان کے بانی ہیں۔ ان کے مترنم الفاظ اور مترنم بحروں نے درد واثر کو بڑھا دیا ہے۔

پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا کے تاثرات بیان کئے ہیں۔

مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا — مرے جی کو یہ آگ لگا سی گئی
مجھے عیش یہاں کوئی پل نہ ملا — مرے جی کو یہ آگ جلا سی گئی

مرے تایہ کے پوت تھے تم، بھی ہم — رہے ایک جگہ پلے ایک ہی ساتھ
مرے باپ نے عمر جو پائی تھی کم — انھیں چھین کے لے گیا موت کا ہاتھ

میں تھی ننھی سی جان غریب بڑی
نہ تو روٹھی کبھی نہ کسی سے لڑی
کبھی بھول کے دُکھ نہ کسی کو دیا
مری باتوں نے گھر ہی کو موہ لیا

تھے تو پیارے ہی تم پہ تھا تم کو بڑا
مجھے ٹیڑھی نظر سے بھی دیکھے ذرا
مرا دھیان کسی کی مجال نہ تھی
مجھے کھیل میں بھی تو کیا نہ دُکھی

مرے سر میں تمھارا ہی دھیان بسا
تمھیں دیوتا مان کے من میں رکھا
مری چاہ کے راج دلارے بنے
مری پھول سی آنکھوں کے تارے بنے

مرا چُھٹوا ابھی سے ہے اس پہ فدا
یہ چچی کا کہا مرے دل نے لکھا
یہ کھولی ہے موہنی میری بہو
وہیں دوڑ گیا مرے مُنھ پہ لہو

اسی بات کے گھر میں جو چرچے ہوئے
مجھے تم نے بھی اپنے لگا کے گلے
کبھی کہتے تھے مجھ کو تمھاری دُلھن
کئی بار کہا مری پیاری دُلھن

اسی طرح گذر گئے چند برس
تمھیں پڑھنے کی دھن لگی ایسی کہ بس
بڑھی عمر ہماری حیا بھی بڑھی
بڑے شوق سے ساری پڑھائی پڑھی

مجھے تم نے پڑھایا بھی پہلے پہل
لگی چلنے ترت مرے اپنے ہی بل
مجھے پڑھنے کا خوب ہی شوق ہوا
یونہیں آپ ہی علم کا ذوق ہوا

تمھیں پڑھنے کو دُور جو بھیجا گیا بڑے شوق سے خوب ہی کام کیا
کوئی تم نے دقیقہ اُٹھا نہ رکھا بڑی محنتیں کیں بڑا نام کیا

ہوئے پڑھ کے نچنت تو عہدہ ملا ہوا گیان کا گُن کا جو شہر میں نام
یہ مزے کا نیا ہی شگوفہ کھلا لگے مینھ کی طرح سے برسنے پیام

مرے تایا بڑے تھے زمانہ شناس بڑے اونچے گھرانے میں ٹھیرا پیام
گیا ٹوٹ ساجی گئی ٹوٹ سی آس مری چاہ کا ہو گیا کام تمام

بڑی دھوم سے آئی تمھاری دُلھن میں بھی کام میں بیاہ کے ایسی جُتی
کوئی اور تھی گو مری پیاری دُلھن کہا سب نے بڑی ہے بہن کو خوشی

مرے دل کی کسی کو بھی تھی نہ خبر مری چاہ کسی پہ نہ فاش ہوئی
بنی جان پہ اتنی کی اُف نہ مگر مرے واسطے بَر کی تلاش ہوئی

مرا ایک جگہ جو پیام لگا مرے دل سے تڑپ کے یہ نکلی دُعا
نہیں چاہ ہی دل میں تو بیاہ ہے کیا تو خدایا یونہیں مجھے جگ سے اُٹھا

مجھے چاہ نے کھا لیا گھن کی طرح مری جان کی کل سی بگڑ ہی گئی
مرا جسم بھی بُھن گیا بن کی طرح یونہیں بستر مرگ پہ پڑ ہی گئی

مرا آخری وقت ہے آن لگا کوئی اور تمھاری ہے "پیاری دُلھن"
مجھے اب بھی تمھارا ہی دھیان بسا نہ بنی پہ رہی ہوں تمھاری "دلھن"

مرے جیتے جی پیت کا پھل یہ ملا مرے تن کو یہ آگ لگا ہی گئی
مجھے پیار کی ریت کا پھل یہ ملا مرے تن کو یہ آگ جلا ہی گئی

سوالات

(۱) اُردو میں گیت کن کن شاعروں نے لکھے ہیں؟ ان میں فضلیت کس کو حاصل ہے۔

(۲) عظمت اللہ خاں غزل گو کو گردن زدنی کے قابل سمجھتے تھے۔ کیا یہ رائے مناسب ہے؟ "سُریلے بول" پڑھ کر جواب لکھئے۔

حفیظ جالندھری

خاں صاحب حفیظ جالندھری۔ غلام قادر گرامی کے شاگرد ہیں اقبال کے کلام نے حفیظ کو متاثر کیا ہے۔ لیکن اُنھوں نے اپنی محنت اور ذہانت سے ایک الگ راہ نکالی ہے حفیظ کا تعلق بھاولپور سے بھی رہا ہے لیکن شاہنامہ اسلام کی تصنیف کے سلسلہ میں اُنھوں نے لاہور میں اپنا دفتر اشاعت قائم کر لیا۔ چند سال سے منظوم تاریخ اسلام مرتب کر رہے ہیں شاہنامہ اسلام کی تین جلدیں شایع ہو چکی ہیں اسکے علاوہ حفیظ نے نظم کے دو مجموعے نغمۂ زار، سوز و ساز بھی مرتب کئے ہیں۔

دنیائے شاعری میں گیتوں کو سرمستی اور سوز گداز کے اعتبار سے بڑا درجہ حاصل ہے۔ حفیظ جالندھری نے اس صنف کو ترقی دے کر اُردو شاعری میں ایک نیا رس پیدا کر دیا ہے۔

ٹوٹی ہوئی کشتی کا ملّاح

یہ اشعار مولانا محمد علیؒ کی وفات پر لکھے گئے ہیں۔

"شب تاریک بیم موج، گرداب چنیں حائل"
نہنگانِ اجل کی نیتّیں بیداد پر مائل
غضب تھا اک شکستہ ناؤ کا منجدھار میں پھنسنا
دفا کی سسکیاں قسمت کا رونا موت کا ہنسنا
فقط اک "سرپھرا" ملّاح طوفانوں سے لڑتا ہے۔
ہوا کے آب کے جنّوں سے شیطانوں سے لڑتا ہے
اگرچہ ناؤ میں انبوہ در انبوہ انساں تھے
یہ سب ملّاح کے ہم قوم تھے یعنی مسلماں تھے
یہ سب تھے عقل و جرأت میں ارسطو اور اسکندر
مگر آرام سے لیٹے ہوئے تھے ناؤ کے اندر
چلی جاتی تھی کشتی خشمگیں موجوں سے ٹکراتی
اُبھرتی بیٹھتی، ڈبتی ڈباتی اور چکراتی
کہیں گرداب کے مُنھ میں کہیں پرشور دھارے پر
کبھی اس کے اشارے پر کبھی اسکے اشارے پر

ہوا کے دوش پر خونخوار عفریتوں کی فوجیں تھیں
پہاڑ اُٹھ اُٹھ کے ٹکراتے تھے یا پانی کی موجیں تھیں
تعجب ہے کوئی پروا نہیں تھی ناؤ والوں کو،
کہ طوفاں میں نظر آتی تھی خامی "باکمالوں" کو
اُنھیں معلوم تھا گرداب نے کشتی کو گھیرا ہے
گھڑی بھر میں یہ بیڑا اب نہ تیرا ہے نہ میرا ہے
اُنھیں دعوے تھے بحرِ زندگی میں ناخدائی کے
اُنھیں گر یاد تھے گرداب میں مشکل کشائی کے
یہ طوفانوں پہ کر سکتے تھے پیچھے دار تقریریں
دکھا سکتے تھے تقریروں میں طوفانوں کی تصویریں
ہوا کا رُخ ذرا بدلے تو سب کچھ جان جاتے تھے
یہ دریا نہنگوں کی نظر پہچان جاتے تھے
یہ سب جو پاؤں پھیلائے ہوئے کشتی میں بیٹھے تھے
پُرانے ناخداؤں اور ملاحوں کے بیٹے تھے
گروہ "سرپھرا" ملاح تنہا تھا اکیلا تھا
ادھر موجوں کی شدّت تھی ادھر پانی کا ریلا تھا
وہ چلّاتا تھا اُٹھو بھائیو آؤ ادھر آؤ
ذرا ہمت دکھاؤ دست و بازو کام میں لاؤ
اِدھر سیلاب بھرآتا ہوا معلوم ہوتا ہے
اُدھر گرداب بل کھاتا ہوا معلوم ہوتا ہے

نہیں ہنگام سونے کا کھڑے ہو جاؤ تن جاؤ
حوادث کے مقابل آہنی دیوار بن جاؤ
مبادا ناؤ داب کے اور بھی کمزور ہو جائے
یہ گرداب بلا شاید وہاں در گور ہو جائے
وہ چلایا، وہ چیخا منتیں کیں آہ و زاری کی
مگر بے سود تھا سب کچھ کسی نے بھی نہ یاری کی
نہ آمادہ ہوا کوئی بھی جرأت آزمائی پر
سبھی ہنستے رہے ملاح کی ہرزہ سرائی پر
ادھر بڑھتی رہی۔ بڑھتی رہی دریا کی طغیانی
اُدھر گھٹتی رہی۔ گھٹتی رہی توفیق انسانی
شکستہ ناؤ کا ملاح بے دم ہو گیا آخر
بڑھا کر حوصلہ تن میں لہو کم ہو گیا آخر
گھرا دریا میں چپو ہاتھ سے پتوار بھی چھوٹی
شکستہ ہو گئے بازو مگر ہمت نہیں ٹوٹی
وہ کشتی کے محافظ ڈھونڈھتا تھا اب بھی یاروں میں
انھیں تاکید کرتا تھا اشاروں ہی اشاروں میں
تھکن کا ہو رہا تھا اب اثر آہستہ آہستہ
لگا جھکنے کو وہ افرازِ سر آہستہ آہستہ
وہی سر جو ہواؤں سے نہ طوفانوں سے جھکتا تھا
نہ فرعونوں سے جھکتا تھا نہ ہامانوں سے جھکتا تھا

نہ جھکتا تھا کبھی سر جو وزیر و شاہ کے آگے

وہ سر اک مرتبہ پھر جھک گیا اللہ کے آگے

تعجب ہے روائے ابر میں سے برق نے جھانکا

کہ یہ اک آخری سجدہ تھا اس مرد مسلماں کا

شکستہ ناؤ میں طوفاں کی اس چیرہ دستی میں

وہ اپنا فرض پورا کر چکا تھا بحر ہستی میں

سوالات

(۱) "حفیظ غنائی شاعر ہے" یہ رائے کہاں تک درست ہے؟

(۲) "حفیظ کی رزمیہ شاعری بقائے دوام حاصل نہیں کر سکتی" آپ کو اس رائے سے کہاں تک اتفاق ہے۔

(۳) حفیظ کے گیتوں کا اُردو میں کیا درجہ ہے؟

(۴) اس نظم میں درد و اثر اور دلکشی کن وجوہ سے پیدا ہوئی ہے؟

جوش ملیح آبادی

شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے مشہور علمی خاندان کے فرد ہیں۔ فقیر محمد خاں گویا مصنف بوستان حکمت جوش کے اجداد میں سے تھے جوش کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا لیکن عالموں اور شاعروں کی صحبت میسر آگئی اور ذوق سلیم کی مدد سے اپنا انفرادی رنگ پیدا کر لیا۔ کچھ دنوں عزیز لکھنوی سے بھی اصلاح لی شاعری کا شوق ابتدائے عمر ہی سے ہے حیدر آباد کے دارالترجمہ میں ایک عرصہ تک

ادبی نقاد کی خدمت انجام دیتے رہے، وہاں سے علیحدہ ہوکر ۱۹۳۶ء میں دہلی سے کلیم نکالا جو اب بند ہو گیا ہے۔ شاعر کی راتیں نقش و نگار، شعلہ و شبنم، فکر و نشاط، جنون و حکمت اور حرف و حکایات، آیات نغمات ان کی غزلوں، رباعیوں کے مجموعے ہیں آج کل حرف آخر لکھنے میں مصروف ہیں۔

جوش عصر حاضر کے انقلابی شاعری کے علمبردار ہیں ان کے کلام میں نئے رجحانات و میلانات حسین شعریت اور والہانہ تاثر کے ساتھ پیوست ہو گئے ہیں۔ موجودہ سیاسی اور معاشرتی حالات نے اس امتزاج میں بڑی مدد دی ہے ۱۹۱۴ء اور ۱۹۳۹ء کی لڑائیاں ۱۹۳۱ء کی تحریک عدم تعاون ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۰ء کا معاشی اضطراب ۱۹۳۱ء کی سیاسی تحریک، اشتراکیت کی نئی رو، تعلیمی نظام کی ناکامی سے بے روزگاری کا سیلاب جمہوریت کا شعور، افلاس و بے اطمینانی سرمایہ و محنت کی کشمکش غرض ان تمام باتوں نے ہماری شاعری کا رُخ بدل دیا ہے۔ اب شاعروں کے دل "زلف پیچاں" سے نکل کر زندگی کی حقیقتوں اور تلخیوں کو محسوس کر رہے ہیں۔ وہ تاریخ کے اشاروں کو سمجھنا چاہتے ہیں اور اسی لئے وہ شاعری کو زندگی سے ہم آہنگ کرنے میں مصروف ہیں، یہ ادبی تحریک دنیا میں انقلابی ادب پیدا کرنے کی وسیع تر کوشش کا ایک جزو معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ یہ نغمہ آج چین، روس، انگلستان اور امریکہ سب ملکوں میں گونج رہا ہے۔

جوش جب زندگی کی تلخیوں سے گریز اور کنارہ کشی کرتے ہیں تو حسن و محبت کی خیالی دنیا میں پہونچ جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود اُن کے کلام میں زندگی کی جھلک اور ایک انقلابی ذہنیت نظر آتی ہے جس میں تمام نوجوان

شاعروں کو متاثر کیا ہے۔

فریبِ ہستی

چمن کی خاک نے تا دیر کی عرق ریزی
کہ گھٹ کے آرزوئے تخمِ گُل نہ رہنے پائے

مٹا کے نقشِ دوئی صیدِ رنگ و بو کے لئے
مہین جال سے بُن کر زمیں کی تہ میں بچھائے

کثافتوں میں لطافت کی شمع روشن کی
نمو کے ظلمتِ افسردہ میں چراغ جلائے

گھٹا کی جیب تراشی فضا پہ ڈالے دام
قدم پہ شمس کے تڑپی قمر کے ناز اُٹھائے

گزشتہ زہرہ جبینوں کے دل نشیں ذرات
نفس کی لَو پہ بڑے اہتمام سے پگھلائے

دیے گئے تھے نباتات کو جو روزِ ازل
کمالِ حسن و لطافت سے وہ سبق دہرائے

جمالِ خاک نشیں کو دکھائی راہ فلک
جمودِ زیرِ زمیں کو تپش کے راز بتائے

تری زمین نے لی آسمان سے گرمی
صبا سے عطر نچوڑا کرن سے رنگ چرائے

بھگو کے رنگ میں ذرات کی بنائیں تہیں
اور ان تہوں میں تکلف کے ساتھ نقش بٹھائے

گرہ لگائی پھر اک مثلِ نرگسِ مخمور
اور اس طرح کہ ہواؤں کی رو میں کھلتی جائے

اور ان تمام مراحل کے بعد ایک کلی
چمن فروز ہوئی پتیوں سے مُنہ کو چھپائے

اور اس کے بعد جو دیکھا تو شام کے ہنگام
پڑی ہوئی تھی بسرِ خاک ناوکِ غم کھائے

یہ کیا نظام ہے معبود! باغِ ہستی کا
کھلے جو صبح کو وقتِ غروب کمھلائے

جب ایک پل میں ہو تعمیرِ ماہ و سال خراب
تو کس امید پہ کوئی فریبِ ہستی کھائے

بیا کہ قصرِ امل سخت سست بنیاد است
بیار بادہ کہ بنیادِ عمر بر باد است

ستارۂ صبح کی رسیلی جھپکتی آنکھوں میں ہیں فسانے
نگارِ مہتاب کی نشیلی نگاہ جادو جگا رہی ہے

شلوکا پہنے ہوئے گلابی ہر اک سبک پنکھڑی چمن میں
رنگی ہوئی سُرخ اوڑھنی کا ہوا میں پلّو سکھا رہی ہے
فلک پہ اس طرح چھپ رہے ہیں ہلال کے گرد و پیش تارے
کہ جیسے کوئی نئی نویلی جبیں سے افشاں چھڑا رہی ہے

باغی انسان

حکمراں آج بھی ہے پیرِ مغاں کیا کہنا — وہی دفتر ہے وہی مُہر و نشاں کیا کہنا
عقل کی تند ہوائیں ہیں خروشاں کب سے — پھر بھی ہے شمعِ جنوں شعلہ فشاں کیا کہنا
کب سے خورشید کی حدّت میں ہے فرمانِ سکوت — پھر بھی جنبش میں ہے ذرّوں کی زباں کیا کہنا
ذرّے ذرّے پہ جہنم کی لگی ہیں مُہریں — پھر بھی دُنیا پہ ہے جنّت کا گماں کیا کہنا
عقل کے دور میں بھی عشق نہیں ہے خاموش — وہی نالے ہیں وہی شورِ فغاں کیا کہنا
کب سے ہے ذوقِ نظر حکمِ شریعت سے حرام — وہی نظریں ہیں وہی حُسنِ جواں کیا کہنا
آج بھی جلوۂ رنگیں کی طلب گاری میں — چشمِ انساں ہے ہر سو نگراں کیا کہنا
ہاں بہ ایں شدّتِ آیات و احادیث حجاب — دستِ خوباں میں ہے شوخی کی عناں کیا کہنا
شبنم و برف کے اس حلقۂ غمناک میں بھی — اُٹھ رہا ہے دلِ انساں سے دھواں کیا کہنا
ترش ہیں ممبر و محراب کے لہجے کب سے — پھر بھی سرشار ہیں رندانِ جہاں کیا کہنا
کب سے قرنوں کا ہے شانوں پہ اُٹھائے ہوئے بار — پھر بھی رقصاں ہے جہانِ گذراں کیا کہنا
سینۂ دہر ہے گو تیرِ حوادث سے فگار — پھر بھی ابرو کی یہ لچکتی ہے کماں کیا کہنا
للہ الحمد کہ خود حکمِ خدا کے باوصف — ہے وہی گرمئ بازارِ بتاں کیا کہنا
آفریں باد کہ اس جبرِ مشیت پہ بھی ہے — دستِ انساں میں بغاوت کی عناں کیا کہنا

ہماری سوسائٹی

حوصلے سرنگوں، امیدیں شل آرزو بارِ یاس سے بوجھل
نشہ بجھتا ہوا سا ایک شرار کیف، گرتی ہوئی سی اک دیوار
ہر لطیفے کی تہ میں رنج و محن ہر ظرافت میں ایک پھیکا پن
شرم سے آب آب جولانی ہر ہنسی۔ شرمسار، کھسیانی
خال و خط پر دھنواں بناوٹ کا کرب۔ بالقصد مسکراہٹ کا
چہچہے سرد، زمزمے مجروح قہقہے تک تھکے ہوئے بے روح
صرف لے دے کے زرق برق لباس ولولے اشک بار، روح اُداس
زرد چہرے نقابِ زریں میں سرد لاشیں لباس رنگیں میں

نہ تلاطم نہ تازگی نہ ترنگ
یہ ہے اپنی سوسائٹی کا رنگ

---

(۱) جوش انقلابی شاعر ہے کیا یہ صحیح ہے۔
(۲) جوش کی زبان اور اس کی تشبیہات و استعارات پر ایک نوٹ لکھئے۔
(۳) جوش نے نوجوان شعرا کو کہاں تک متاثر کیا ہے؟

ن ۔م ۔ راشد

نذر محمد راشد نام ہے مولد اکال گڑھ ضلع گجرانوالہ پنجاب پیدائش یکم اگست ۱۹۱۰ء ایم، اے ۔معاشیات میں گورنمنٹ کالج لاہور سے پاس کیا شاعری سات برس کی عمر میں ایک ہجو سے شروع کی۔ ابتدائی شاعری میں عہد حاضر کے بعض شعراء مثلاً جوش، حفیظ، اختر شیرانی، روش صدیقی کے مخلوط اثرات ملتے ہیں۔ انفرادیت ان کی شاعری میں تقریباً ۱۹۳۲ء سے پیدا ہوئی۔ انگریزی مصنفین میں ڈی، ایچ، لارنس۔ آسکر وائلڈ سے زیادہ متاثر ہیں۔

مجموعہ کلام ماورا شائع ہو چکا ہے۔

انسان

(سانیٹ)

الٰہی تیری دنیا جس میں ہم انسان رہتے ہیں
غریبوں جاہلوں مردوں کی بیماروں کی دنیا ہے
یہ دنیا بےکسوں کی اور لاچاروں کی دنیا ہے
ہم اپنی بےبسی پر رات دن حیران رہتے ہیں
ہماری زندگی اک داستان ہے ناتوانی کی
بنا لی اے خدا اپنے لیے تقدیر بھی تو نے
اور انسانوں سے پہلی جرأت تدبیر بھی تو نے
یہ داد اچھی ملی ہے ہم کو اپنی بےزبانی کی

شاعرِ درماندہ

زندگی تیرے لیے بسترِ سنجاف و سمور
اور میرے لئے افرنگ کی دریوزہ گری
عافیت کوشیٔ آبا کے طفیل،
میں ہوں درماندہ و بے چارہ ادیب
خستۂ فکرِ معاش !
پارۂ نانِ جویں کے لیے محتاج ہیں ہم
میں، مرے دوست، مرے سیکڑوں اربابِ وطن
یعنی افرنگ کے گلزاروں کے پھول

تجھے اک شاعرِ درماندہ کی امید نہ تھی
مجھ سے جس وقت ستارہ ترا وابستہ ہوا
تو سمجھتی تھی کہ اک روز مرا ذہنِ رسا
اور مرے علم و ہنر
بحر و بر سے تری زینت کو گہر لائیں گے !
میرے رستے میں جو حائل ہوں مرے تیرہ نصیب
کیوں دعائیں تری بے کار نہ جائیں
تیرے راتوں کے سجود اور نیاز

اے مری شمع شبستانِ وفا
بھول جا میرے لیے
زندگی خواب کی آسودہ فراموشی ہے!
تجھے معلوم ہے مشرق کا خدا کوئی نہیں
اور اگر ہے تو سراپردۂ نسیاں میں ہے
تو مسرت ہے مری تو مری بیداری ہے
مجھے آغوش میں لے
دو "انا" مل کے جہاں سوز بنیں
اور جس عہد کی ہے تجھ کو دعاؤں میں تلاش
آپ ہی آپ ہویدا ہو جائے!

سوالات

۱۔ "ترقی پسند شاعر قوافی و ردیف کو شاعری کا لازم جزو نہیں سمجھتے اور اس کی پابندی سے شاعری کی وسعتوں کو محدود کرنا نہیں چاہتے۔" کیا ان کا یہ خیال صحیح ہے؟

۲۔ "نظم آزاد نے اردو شاعری کو نئی ہیئت اور نیا آہنگ دیا ہے۔" اس پر بحث کیجیے۔

۳۔ "ترقی پسند شاعری عریانی، لامذہبیت اور بے راہ روی کا پروپاگنڈہ ہے۔" آپ کا کیا خیال ہے؟

مزید مطالعہ کے لیے

نیا ادب میری نظر میں۔ نگار (جدید شاعری نمبر) ن م راشد۔

فیض احمد فیض

سنہ ۱۹۱۱ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے سنہ ۱۹۳۳ء میں انگریزی میں سنہ ۱۹۳۴ء میں عربی میں ایم، اے کیا۔ شاعری کا شوق بچپن سے ہے۔ شروع میں قدیم طرز کی غزلیں لکھیں لیکن اب ترقی پسند رجحانات کی وجہ سے شاعری کا رخ بدل گیا ہے دوسرے آزاد نظم گو شعراء کے برخلاف قوافی و ردیف کی پابندی کرتے ہیں، اور موجودہ ترقی پسند شعراء میں ایک خاص طرز فکر اور اسلوب بیان کے مالک ہیں۔ ایک مجموعہ کلام "نقش فریادی" شائع ہو چکا ہے۔

اے دلِ بیتاب ٹھہر!

تیرگی ہے کہ اُمڈتی ہی چلی آتی ہے
شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے
چل رہی ہے کچھ اس انداز سے نبضِ ہستی
دونوں عالم کا نشہ ٹوٹ رہا ہو جیسے

رات کا گرم لہو اور بھی بہہ جانے دو
یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسارِ سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دلِ بیتاب ٹھہر!

ابھی زنجیر چھنکتی ہے پسِ پردۂ ساز
مطلق الحکم ہے شیرازۂ اسباب ابھی
ساغرِ ناب میں آنسو بھی ڈھلک جاتے ہیں
لغزشِ پا میں ہے پابندیٔ آداب ابھی

اپنے دیوانوں کو دیوانہ تو بن لینے دو
اپنے میخانوں کو میخانہ تو بن لینے دو
جلد یہ سطوتِ اسباب بھی اُٹھ جائے گی
یہ گراں باریِ آداب بھی اُٹھ جائے گی
خواہ زنجیر چھنکتی ہی چھنکتی ہی رہے

سوالات

۱۔ ابہام اور اشاریت ترقی پسند شاعری کا خاص آرٹ ہے۔ شاعر نے اس نظم میں اس آرٹ سے کیا کیا کام لیا ہے؟

۲۔ نظم کا مرکزی خیال کیا ہے؟

۳۔ "فیض نے ہیئت کی پابندی کے باوجود شاعری میں نئی وسعتیں پیدا کیں۔" آپ کو اس رائے سے کہاں تک اتفاق ہے؟

مزید مطالعہ کے لیے

نقشِ فریادی۔

علی سردار جعفری

پیدائش ۱۹۱۹ء انٹرمیڈیٹ علی گڈھ سے کیا۔ ۱۹۳۶ء میں بی، اے کے متعلم تھے تو اسٹرائک کے سلسلے میں وہاں سے نکال دیے گئے اس کے بعد ۱۹۳۸ء میں عربک کالج دہلی سے بی، اے کیا۔ پہلے مسٹر گاندھی کی تعلیمات سے بہت متاثر تھے لیکن بعد میں مارکس اور اینگلز کا اثر بہت قبول کیا۔ ترقی پسند مصنفین کی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ سیاسیات میں حصہ لینے کے سلسلے میں قید وبند کی سختیاں بھی جھیل چکے ہیں۔

ٹوٹا ہوا ستارہ

آرہا ہے اک ستارہ آسماں سے ٹوٹ کر
دوڑتا اپنے جنوں کی راہ پر دیوانہ وار
اپنے دل کے سینۂ سوزاں میں خود جلتا ہوا
منتشر کرتا ہوا دامانِ ظلمت میں شرار
اپنی تنہائی پہ خود ہی ناز فرماتا ہوا
شوق پر کرتا ہوا آئینِ فطرت کو نثار
کس قدر بیباک کتنا تیز کتنا گرم رو
جس سے سیاروں کی آسودہ خرامی شرمسار

موجۂ دریا اشاروں سے بلاتی ہے قریب
اپنی سنگیں گود پھیلائے ہوئے ہے کوہسار
ہے ہوا بے چین آنچل میں چھپانے کے لئے
بڑھ رہا ہے کرۂ گیتی کا شوقِ انتظار
لیکن ایسا انجم روشن جبین و تابناک
خود ہی ہو جاتا ہے اپنی تابناکی کا شکار

سوالات

۱۔ اس نظم میں شاعر کیا کہنا چاہتا ہے؟ تارہ سے کیا مراد ہے؟
۲۔ "علی سردار جعفری کے ہاں انقلابی جذبے کے ساتھ ایک گہرا تفکر اور فلسفیانہ اسلوب بیان ملتا ہے" یہ کہاں تک صحیح ہے؟
۳۔ جدید شعراء کے ہاں مایوسی اور یاس کی کیفیت کیوں زیادہ ہے؟

نشور واحدی

وطن مضافات اعظم گڈھ میں ہے تعلیم الہ آباد میں ہوئی، اب عرصہ سے کانپور میں مقیم ہیں۔ عربی اور فارسی کے فاضل ہونے کے علاوہ مفکّر بھی ہیں اور اس زمانے کے سیاسی اور معاشرتی تحریکات پر اکثر غور و فکر کرتے رہتے ہیں جن پر ہلکی سی تنقید ان کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ ان کے کلام کا پہلا مجموعہ "صہبائے ہند" کے نام سے شائع ہوچکا ہے، دوسرا حصّہ "آتش و نم" ابھی حال ہی میں الہ آباد سے شائع ہوا ہے۔

میرے لیے کیا ہے کچھ بھی نہیں

یہ گاؤں کا منظر سناٹا اور شام کی دھندلی تاریکی
اک شام بہت رنگین مگر مفلس کی نگاہوں میں پھیکی
دھرتی پہ یہ پانی سونے کا آکاش پہ نہریں چاندی کی
یہ چاند یہ تارے یہ دریا میرے لیے کیا ہے کچھ بھی نہیں

یہ شہر کی چلتی سڑکوں پر ہر سمت دکانیں نورانی
بجلی میں بھی جلتا ہو جیسے افلاس کے پتہ کا پانی
چیزوں کی گرانی میں شامل غربت کے لہو کی ارزانی
یہ ساز یہ سامانِ عشرت میرے لیے کیا ہے کچھ بھی نہیں

راتوں کے اندھیروں میں جگمگ جگمگ یہ فضا میخانوں کی
میزوں پہ نظارے مستی کے بہکی ہوئی لے دیوانوں کی
بوتل کی نوائے قلقل میں ہلکی سی کھنک پیمانوں کی
یہ شیشہ یہ ساقی یہ صہبا میرے لیے کیا ہے کچھ بھی نہیں

آنکھوں پہ مری احسان ہے کیا سبزوں پہ اگر ہے رعنائی

کیوں پوچھنے جاؤں کیاری میں پھولوں کا مزاجِ رعنائی

کیا کام ہے مجھ کو گلشن میں کلیاں ہوں کھلی یا مرجھائی

یہ پھول یہ شبنم سیرِ فضا میرے لیے کیا ہے کچھ بھی نہیں

کالج کی یہ تعمیرِ خنداں ممنونِ غم و آلام نہیں

اس میں کسی مفلس کے گھر کے غمگین پسر کا کام نہیں

سامانِ تجارت ہے یہ بھی سامانِ مفادِ عام نہیں

یہ علم یہ حکمت ہوشربا میرے لیے کیا ہے کچھ بھی نہیں

بے جان ہو جب نقشِ ہستی تصویرِ تمنا کیا ہوے

تاراج کے خونیں پنجے میں تہذیب کی مینا کیا ہوے

چیلوں کے نجاست خانے میں بیچارہ پپیہا کیا ہوے

یہ نغمہ یہ شعر و سازِ نوا میرے لیے کیا ہے کچھ بھی نہیں

سوالات

۱۔ اس نظم میں تاثیر اور دل کشی کن وجوہ سے پیدا ہوئی ہے؟

۲۔ کالج کو شاعر نے سامانِ تجارت بتایا ہے۔ اس سے اس کی کیا مراد ہے؟

معین احسن جذبی

معین احسن جذبی پچھلی جنگ عظیم شروع ہونے سے دو سال پہلے پیدا ہوئے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم کا زمانہ خلافت اور ترک موالات کی تحریک کا زمانہ تھا۔ شاعری میں حامد شاہجہاں پوری اور صادق جھانسوی سے اصلاح لیتے رہے۔ اعلیٰ تعلیم آگرہ کالج آگرہ میں حاصل کی۔

جذبی کو الفاظ کے انتخاب کا ایک خاص سلیقہ ہے۔ اور اس سلیقے سے جب الفاظ اور فقروں کی تکرار کرتے ہیں تو شعر میں ایک خاص ترنم اور دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔

ان کا مجموعہ کلام "فروزاں" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

مرنے کی دعائیں کیوں مانگو[1] جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا اب خواہش دنیا کون کرے

جب کشتی ثابت و سالم تھی جینے کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

ہاں وادیٔ ایمن بھی ہے وہی ہاں برق کا مسکن بھی ہے وہی
اور ہوش کا خرمن بھی ہے وہی پر ان سے تقاضا کون کرے

جو آگ لگائی تھی تم نے اس کو تو بجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

دنیا نے ہمیں چھوڑا جذبی ہم چھوڑ نہ دیں کیوں دنیا کو
دنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں اب دنیا دنیا کون کرے

(۲)

ہم اس دہر کے ویرانے میں جو کچھ بھی نظارا کرتے ہیں
اشکوں کی زبانی کہتے ہیں، آہوں میں اشارا کرتے ہیں
کیا تجھ کو خبر کیا تجھ کو پتا دن رات خیالوں میں اپنے
اے کاکل گیتی ہم تجھ کو جس طرح سنوارا کرتے ہیں
اے موج بلا ان کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارا کرتے ہیں
کیا جانیے کب یہ پاپ کٹے کیا جانیے وہ دن کب آئے
جس دن کے لیے ہم اے جذبی کیا کچھ نہ گوارا کرتے ہیں

سوالات

۱ - "جذبی کی شاعری میں رومان و انقلاب کا ایک لطیف امتزاج پایا جاتا ہے" یہ رائے کہاں تک درست ہے؟

۲ - "جذبی نے پرانے ساز پر نئے راگ الاپے ہیں" آپ کو اس رائے سے کہاں تک اتفاق ہے؟

۳ - جدید انقلابی شاعری میں جذبی کا کیا درجہ ہے؟

مزید مطالعہ کے لیے

مقدمہ "فروزاں" از آل احمد سرور